ماہنامہ

# اردو دنیا

نئی دہلی

"اقلیتوں کا سماجی اور معاشی ایمپاورمنٹ حکومت کی پہلی [illegible]
ایمپاورمنٹ پر منظم طور پر توجہ دی جائے گی۔
ہم اردو کے فروغ کے لیے پابند عہد ہیں [illegible]

وزیر اعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ

3 جولائی کو وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمہ [illegible] کی طرف سے [illegible] منعقدہ "اقلیتوں [illegible] تعلیم" پر کنونشن کے افتتاح کے موقعے پر مرکزی وزیر برائے ترقی انسانی وسائل جناب ارجن سنگھ، وزیر اعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ کا استقبال کرتے ہوئے

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
محکمہ اعلیٰ تعلیم، وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

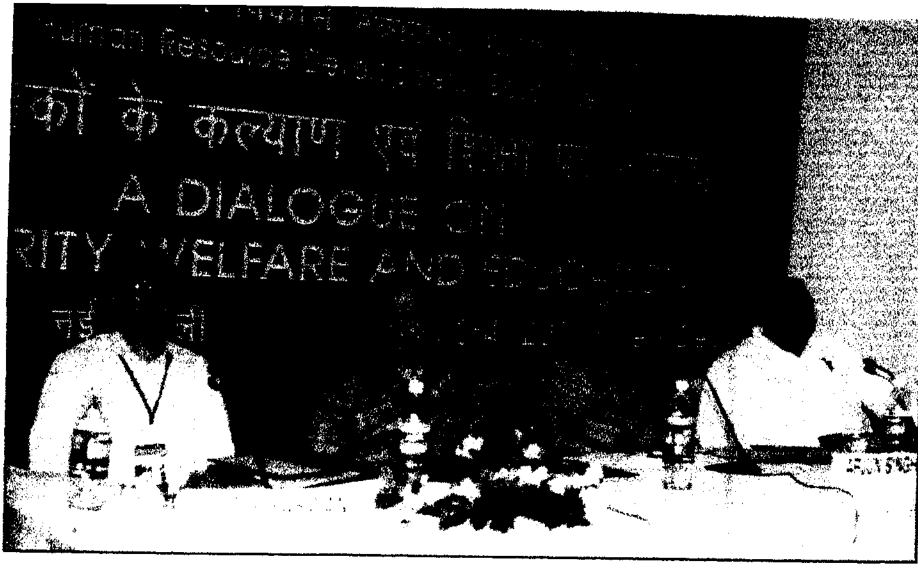


وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومتِ ہند کی جانب سے اقلیتوں کی فلاح و بہبود اور ان کی تعلیمی ترقی سے متعلق صلاح ومشورہ کرنے اور ایک بہتر لائحۂ عمل تیار کرنے کے لیے
3 اور 4 ؍جولائی 2004 کو بالترتیب وگیان بھون اور سمراٹ ہوٹل میں ''اقلیتی فلاح و بہبود اور تعلیم'' کے زیرِ عنوان ایک کانفرنس منعقد کی گئی جس میں ملک بھر سے
ماہرینِ تعلیم، اسکالرز، دانشوران اور مختلف سیاسی شخصیات نے شرکت کی۔ اس موقعے پر لی گئی تصویر میں (دائیں سے) جناب محمد علی اشرف فاطمی (وزیرِ مملکت وزارت ترقی انسانی وسائل)،
جناب ارجن سنگھ (مرکزی وزیر برائے ترقی انسانی وسائل)، ڈاکٹر رفیق زکریا اور جناب بی. ایس. باسوان۔

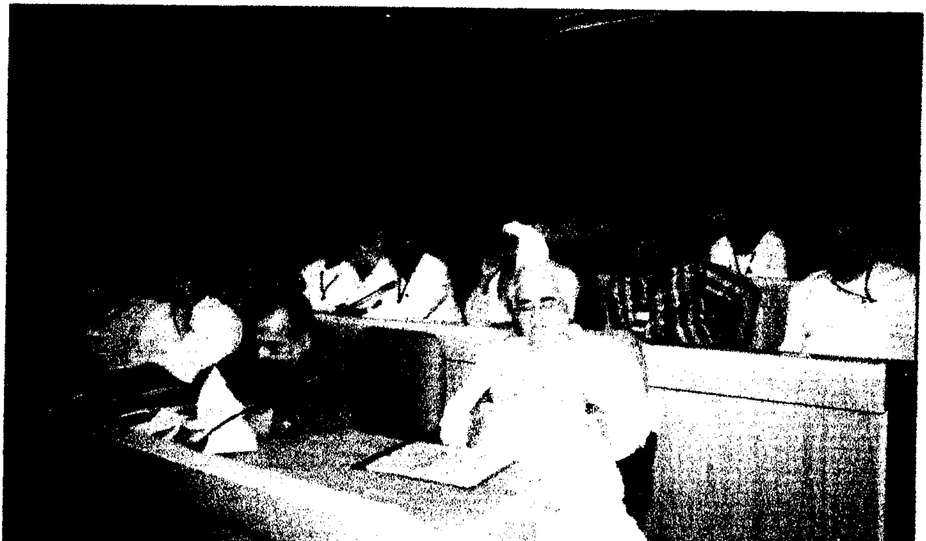

اسی موقعے پر لی گئی تصویر میں جناب سلمان خورشید اور جناب موسیٰ رضا اور دیگر شرکا کو بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

ماہنامہ

# اردو دُنیا نئی دہلی

جلد-6، شمارہ-8 اگست 2004

مدیر: ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ

معاون مدیر: فیروز عالم

ناشر اور طابع:

ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ ثانوی و اعلا تعلیم، حکومتِ ہند

کمپوزنگ: قومی اُردو کونسل

مطبع: جے کے آفسیٹ پرنٹرس، جامع مسجد، دہلی 6

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اُردو کونسل

قیمت-/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

غیر ممالک کے لیے

10 امریکی ڈالر، سالانہ (بحری ڈاک سے)

15 امریکی ڈالر، سالانہ (ہوائی ڈاک سے)

چیک یا ڈرافٹ NCPUL کے نام روانہ کریں۔

صدر دفتر:

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6

آر-کے-پورم، نئی دہلی - 066 110

فون: 26103381, 26103938

فیکس: 26179657 : 26108159

ویب سائٹ:

http://www.urducouncil.nic.in

email: urducoun@ndf.vsnl.net.in

شعبۂ فروخت:

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7،

آر-کے-پورم، نئی دہلی-110066

فون: 26109746

شاخ: 110-7-22 چھتہ ڈاکٹر ساجد یار جنگ کمپلکس،

بلاک نمبر 5-1، چھتہ بازار، حیدرآباد-500002

فون: 24415194 - 040

# اس شمارے میں

**آپ کی بات** ........ خطوط ........2

**ہماری بات** ........ اداریہ ........5

● اقلیتوں کی فلاح و بہبود اور تعلیم (گیسٹ کالم) ........ ڈاکٹر منموہن سنگھ ........6

● مشیر الحسن سے گفتگو (انٹرویو) ........ سکینہ یوسف خاں ........8

● آزادی کے بعد اردو کی ادبی صحافت — دلّی میں ........ مخمور سعیدی ........10

● اردو — مشترکہ قومی وراثت ........ رام پرکاش کپور ........15

● اردو زبان کا تحفظ: چند عملی تجاویز ........ عزیز احمد ........20

● اردو سنیما 1947 تک ........ محمد شاہد حسین ........22

● مسئلہ بچوں کی تعلیم و تربیت کا ........ مینا کشی ........25

● بچہ مزدوری کے مسائل (اسباب اور تدابیر) ........ ایس. ایس. چوہان ........27

● انٹرنیٹ پر کنٹرول کے لیے سرکاری پیش رفت کی ضرورت ........ بھرت جھن جھن والا ........31

● پولیو کے خلاف آواز جہاں تک پہنچے ........ حکیم اشہر قدیر ........32

**گوشۂ ادب:**

● اکبر الٰہ آبادی: نئی تہذیبی ریاست اور بدلتے ہوئے اقدار ........ شمس الرحمٰن فاروقی ........34

● موت نیند میں چلے جانے کا نام ہے ........ وشنو کھرے ........40

● بڑے بڑے پنکھوں والا ایک بوڑھا (کہانی) ........ گابریل گارسیا مارکیز ........41

**گوشۂ فروغِ کتب**

● مرثیہ ("اردو اصناف (نظم و نثر) کی تدریس" سے اقتباس) ........ آغا مرزا محمود ........45

● فلسفۂ تاریخ اور سماجیات ("تاریخ اور سماجیات" سے اقتباس) ........ عائشہ بیگم ........51

**طلبہ کے لیے**

● لائبریری اور انفارمیشن سائنس میں کیریئر کے مواقع (کیریئر گائیڈنس) .. شری ناتھ سہائے ........56

● فرنٹ پیج ........ شفقت علی ........58

● اردو لسانیات (کوئز) ........ درخشاں زریں ........61

● بڑھتے قدم (کمپیوٹر سینٹر کے فارغ طلبہ کے انٹرویو-13) ........ فیروز عالم ........64

**اردو خبر نامہ** ........ ادارہ ........65

**تبصرہ و تعارف** ........ کتابوں پر تبصرے ........74

● خوشبو (سفرنامہ)/گلزار ........ مبصر: اسعد فریدی

● دل کی گیتا/خواجہ دل محمد (مرتب: مخمور سعیدی) ........ مبصر: رئیس احمد

● میزان الطب/حکیم محمد اکبر ........ مبصر: فیضان احمد جیراجپوری

● افق/دویندر پنواری ........ مبصر: عبدالرب

● اشاریہ دلگداز/محمد قمر سلیم ........ مبصر: خورشید زمانی رودولوی

**بچوں کا گوشہ**

● ہمیشہ دیر سے آنے والی لڑکی ("دوربین" سے ایک کہانی) ........ مالا جنار دھن ........78

# آپ کی بات

■ **رام پرکاش کپور، ایل.بی.جی. 04، پی.ایچ.اے. بلیو رنم، سیکٹر-28، گڑگاؤں، ہریانہ**

"اردو دنیا" کے جون کے شمارے میں اردو غزل کوئز میں سوال نمبر 30:

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانہ مرگیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

"کس شاعر کی غزل کا شعر ہے؟" جواب میں "منور لکھنوی" لکھا ہے جو کہ غلط ہے۔ دراصل یہ شعر آنجہانی راجہ رام نرائن موزوں کا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جناب رام نرائن موزوں نے یہ شعر نواب سراج الدولہ کی وفات (شہادت) پر کہا تھا۔

جولائی کے شمارے میں پران کیلا صاحب نے محترمہ شیبا فہمی کے مضمون کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"...... کتنے لوگ ہیں جو اپنا شجرۂ نسب ہندوؤں سے جوڑتے ہیں۔ جنھوں نے اسلام قبول کیا تھا۔" ویسے تو ایسے بے شمار ادبا، شعرا، دانشور گزرے ہیں اور اب بھی موجود ہیں جو اپنا شجرۂ نسب ہندوؤں سے جوڑتے ہیں۔ میں یہاں بیسویں صدی کے عظیم ترین شاعر علامہ اقبال کی مثال دینا چاہتا ہوں۔ وہ اپنے ہندستانی ہونے اور برہمن نژاد ہونے پر ہمیشہ فخر کرتے رہے اور کھلے عام اس کا اظہار کرتے تھے۔

میں اصل کا خاص سومناتی
آبا میرے لاتی و مناتی
ہے فلسفہ میرے آب و گل میں
پوشیدہ ہے راز ہائے دل میں
مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی
برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است

[مجھے دیکھو، کیوں کہ ہندستان میں دوسرا ایسا نہیں دیکھو گے جو برہمن زادہ ہوتے ہوئے بھی روم و تبریز کا محرمِ اسرار ہو۔]

■ **رضوان خاں، سکریٹری، بزم اردو، شیخ سرائے، سیتاپور**

جولائی 2004 کے شمارے میں جناب پران کیلا کا طویل خط شائع ہوا ہے جس میں انھوں نے محترمہ شیبا فہمی کے مضمون کو Condemn کرنے کی کوشش کی ہے۔ کیلا صاحب کے خط میں کئی قابلِ مذمت باتیں ہیں۔ یہاں میں ایک نکتے پر اظہار خیال کر رہا ہوں۔ پران کیلا صاحب نے محترمہ شیبا فہمی کے اس بیان پر بھی اعتراض کیا ہے کہ ہندی فلموں میں نغمے اور مکالمے اردو میں ہونے کے باوجود انھیں ہندی فلم کہا جاتا ہے۔ کیلا صاحب نے اردو گانوں اور مکالموں والی فلموں کو ہندی فلم کہے جانے کو اس طرح Justify کرنے کی ناکام کوشش کی ہے کہ "ہندی" لفظ زبان کے علاوہ ہندستانیوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اسی وجہ سے اردو زبان والی فلموں کو ہندی فلم کہنا مناسب ہے۔ یہ مانا کہ عرب ممالک میں 'ہندی' لفظ ہندستانیوں کے لیے استعمال ہوتا ہے اور علامہ اقبال نے بھی کہا ہے "ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا" مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جس طرح ہندستان کے سبھی لوگ ملک کی نسبت سے ہندی ہیں اس طرح ہندستان کی سبھی زبانیں ہندی ہیں۔ اس طرح تو ہندستان کی دوسری زبانیں مثلاً تمل، تیلگو، کنڑ، اڑیا، بنگلہ سبھی "ہندی" کہی جانی چاہئیں اور ان زبانوں کی فلموں کو بھی ہندی فلم کہا جانا چاہیے۔ ظاہر ہے ایسا نہیں ہوگا۔ تو پھر اردو کو ہندی کہنا یا اردو فلم کو ہندی فلم کہنا بھی غلط ہے۔

■ **محمد یعقوب الرحمان، 4۔ حبیب بلاکس، شندے نگر، ایوت محل، مہاراشٹر**

"اردو دنیا" کے تازہ شمارے میں "اردو کی تہذیبی معنویت" عنوان کے تحت علی محمد خسرو مرحوم کی جاندار تحریر نظروں سے گزری، اسی طرح مخمور سعیدی صاحب نے "آزادی کے بعد اردو کی ادبی صحافت۔ دلی میں" عنوان کے تحت معلوماتی تحریر پیش کی ہے۔ اب ذرا آگے بڑھا تو ایک عجیب و غریب تحریر نظر میں آئی۔ اردو کو کبھی ایک آنکھ کہنا، کبھی گنگا جمنی تہذیب کی علامت قرار دینا تو کبھی اردو کو ہندی کی بہن قرار دینا، اس قسم کی باتوں سے اردو کے مسائل تو حل ہونے سے رہے البتہ انشاپرداز اپنی واہ واہ کروا لینے میں کامیاب رہتے ہیں۔ "گزارش بہ زبانِ اردو" عنوان کے تحت حمیدہ چوپڑا کی تحریر اسی قسم کی کوشش ہے۔ ارے بھئی! زبان تو بس زبان ہوتی ہے جو اپناتا ہے اس کی ہوتی ہے۔ الحمدللہ میں مسلمان ہوں لیکن عربی میری مادری زبان نہیں جبکہ افریقی اور کئی عرب ممالک میں رہنے والے عیسائی اور یہودی عربی بولتے ہیں، عربی لکھتے ہیں۔ تو کیا وہ سب مسلمان ہو گئے؟ ملک زادہ جاوید صاحب نے امیر آغا قزلباش مرحوم کے تعلق سے جو کچھ لکھا ہے وہ اگر سچ بھی ہے تو اسے پیش کرنے کی ضرورت کیا ہے؟ یہ باتیں پڑھ کر مرحوم کے پسماندگان کو سوائے شرمندگی کے اور کیا حاصل ہوگا؟ مغربی کلچر میں اس قسم کی داستانیں ممکن ہے پسندیدگی کی نظروں سے دیکھی جاتی ہوں، ہماری تہذیب میں ان کی گنجائش نہیں۔

اللہ حافظ کہنے میں برائی کیا ہے؟ اللہ اور خدا ایک ہی ذات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ میری زبان پر یہ کلمہ ابھی چڑھا نہیں لیکن کل اگر ایسا ہوجائے تو

میرے تقویٰ میں کوئی اضافہ نہ ہوگا اس کا مجھے یقین ہے۔ اگر کسی وقت میری زبان سے ''بھگوان میری مدد کر'' نکل جائے تو یہاں ''بھگوان'' سے مراد ''اللہ'' ہی ہوگا۔ وہ تو نیتوں کو جاننے والا ہے۔ اسی طرح بشیر احمد صاحب کا اپنے مضمون میں انگریزوں کے سامنے یہ کہنا کہ ہماری ثقافت میں چھوٹے بھائی کی حیثیت کتے کی سی ہوتی ہے۔ دلیل میں فارسی کہاوت بھی پیش کی ہے۔ یہ مضمون انگریز تو پڑھنے سے رہے۔ ہماری وہ نسل جو اپنی روایت سے واقف نہیں اس کا یہی مطلب لے تو نتیجہ برا بھی نکل سکتا ہے۔

■ ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی، سابق ممبر راجیہ سبھا، نئی دہلی

''اردو دنیا'' کا اپریل 2004 کا شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ ''امریکی درس گاہوں میں اردو''، ''نیپال میں اردو کی صورت حال''، ''اردو میں عربی کے خود ساختہ الفاظ''، ''ہوائی جہاز کی اڑان کے سو سال''، ''عام انسانی حقوق'' جیسے مفید اور معلوماتی مضامین سے بہت زیادہ مستفید ہوا۔ ایسے کارآمد مضامین کی اشاعت پر دلی مبارک باد قبول فرمائیں۔

ایک مراسلہ نگار کی یہ رائے کہ سابق وزیر فروغ انسانی وسائل نے اپنے دورِ وزارت میں اردو کے لیے جو کچھ کیا وہ آزاد ہندستان کی تاریخ میں کسی دوسرے وزیر نے نہیں کیا، تمام تر مبالغہ آرائی ہے۔

کاش اس سے پہلے کے شمارے میں ڈرامہ ''انسان'' شائع نہ کیا جاتا۔ اس میں مذہب پر دل آزار حملے کیے گئے ہیں۔ ''اردو دنیا'' کو اس قسم کے مضامین کی اشاعت سے احتراز کرنا چاہیے۔

■ ڈاکٹر ارجمند آرا، شعبۂ اردو، فیکلٹی آف آرٹس اینڈ سوشل سائنسز، یونیورسٹی آف دہلی، دہلی-7

''اردو دنیا'' جولائی 2004 کے شمارے میں آپ نے میرا وہ خط شائع کیا ہے جو میں نے ''اردو دنیا'' کی معاون مدیر کی ذمے داریوں سے سبکدوشی کے لیے تحریر کیا تھا کیونکہ میں چند ایسے اکادمک کاموں میں مصروف ہوگئی تھی جن کے سبب ''اردو دنیا'' کو مزید وقت نہ دے سکتی تھی۔ میرے تفصیلی ای میل کے کچھ حصوں کا جو اردو ترجمہ شائع ہوا ہے اس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ میں ہندستان کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ رہی ہوں۔ خط کو پڑھ کر میرے دوستوں اور خیر خواہوں نے، جن میں سے اکثر کو معلوم نہ تھا کہ میں ملک سے باہر گئی ہوں، میری خیر خبر لینی شروع کردی۔ ظاہر ہے کہ میرے لیے یہ کوئی خوش کن صورتِ حال نہیں ہے کیوں کہ غلط بیانی کے ذریعے خبروں میں رہنے کی عام روش کو میں سخت معیوب سمجھتی ہوں۔ اس لیے ''آپ کی بات'' کالم میں اس وضاحت کو شائع کرانا ضروری سمجھتی ہوں کہ میں رالف رسل کی خودنوشت سوانح کے اپنے ترجمے کو آخری شکل دینے کے لیے گرمیوں کی چھٹیوں میں لندن گئی تھی اور دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے میں اب بھی وابستہ ہوں۔

امید ہے کہ اگست کے شمارے میں اس وضاحت کو شائع فرمائیں گے تاکہ مزید غلط فہمیاں نہ ہوں۔

■ شاغل ادیب، 1-4-304/9/3، زیب منزل، مشیر آباد، حیدرآباد-48

''اردو دنیا'' پابندی سے باصرہ نواز ہو رہا ہے۔ جون 2004 کا شمارہ ابھی ابھی ملا ہے۔ اس شمارے میں گوشۂ ادب میں اردو کی عظیم شخصیت عالی جناب شمس الرحمان فاروقی کا مضمون ''میرا ذہنی سفر'' بہت خوب ہے۔ نامور افسانہ و ناول نگار جناب عبدالصمد کا انٹرویو بھی خوب ہے۔ جناب شہاب ظفر اعظمی کے سوالات فکر انگیز ہیں اور مخاطب کے جوابات مختصر مگر جامع ہیں۔ جناب ابرار رحمانی نے ''مسندِ خاک کا شاعر'' میں عرفان صدیقی کو بھرپور خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ گوشۂ فروغِ کتب میں محمد حسین آزاد کا مضمون مرزا عبدالرحیم خان خاناں بھی پڑھنے کی چیز ہے۔ آپ ''اردو دنیا'' کو ماہ بہ ماہ اپنے حسنِ انتخاب اور کمالِ ادارت سے خوب سے خوب تر بنا رہے ہیں۔ مبارکباد قبول فرمائیے۔

■ امتیاز احمد دانش، منسارہ مترالے، ہادی مارکیٹ، آرہ، بہار

''اردو دنیا'' ماہ جون کے شمارے میں زبان اردو کے ضمن میں نئی حکومت سے جو امیدیں آپ نے وابستہ کیں، صدر جمہوریہ کے خطاب سے آپ کی امیدیں اور پختہ ہوئی ہوں گی۔ نئی حکومت کے اس اعلان سے کہ ''اردو کو آئین کی دفعہ 345 اور 347 کے تحت نافذ کرنے اور فروغ دینے کی کوشش کی جائے گی'' اردو داں طبقے کے دلوں میں یقیناً امید کی نئی کرن پھوٹی ہے۔

زیرِ نظر شمارے میں ''آج'' کراچی سے ماخوذ فاروقی صاحب کی مختصر خودنوشت نگاہ کو مسخر کرلینے والی ہے۔ ابرار رحمانی نے عرفان صدیقی کی غزل گوئی کا محاکمہ کرتے ہوئے ان کی شخصیت کو بڑے اچھے ڈھنگ سے اُجاگر کیا ہے۔ شہاب ظفر اعظمی کی عبدالصمد سے گفتگو اچھی لگی۔ وہیں کیریئر گائیڈنس سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ جریدے کی دن دونی رات چوگنی ترقی کے لیے دعا گو ہوں۔

■ زبیر احمد وانی، یاری پورہ، کولگام، اننت ناگ، کشمیر

خدا سے دعا ہے کہ ''اردو دنیا'' جس رفتار سے ترقی کی منزلوں کو چھو رہا ہے اسی رفتار سے مستقبل میں بھی آگے بڑھتا رہے۔ رسالہ پابندی سے موصول ہو رہا ہے، جس سے قومی اردو کونسل کی سرگرمیوں کی جانکاری بھی مل رہی ہے۔ اردو میں اس مزاج کا کوئی دوسرا رسالہ نہیں دیکھا ہے۔ اس رسالے کی قیمت بے حد مناسب ہے اور ہر قاری خرید کر پڑھ سکتا ہے۔ اردو حلقوں کی خبروں کی شمولیت سے اردو دنیا سے بھی خوب واقفیت ہو رہی ہے۔ علم و ادب، تعلیم، سماج اور سیاست، ٹیکنالوجی غرض ہر گوشے پر آپ کی کوشش اور محنت لائقِ مبارک باد ہے۔ پچھلے کئی شماروں میں آپ نے HTML کے بارے میں کچھ مضامین شائع کیے جو بہت ہی کارآمد ثابت ہوئے۔ امید کہ آگے بھی ایسے مضامین پڑھنے کو ملتے رہیں گے۔

■ **محمد گوہر، 463، ایم.ایچ.بی. کالونی، سیلے نزون، ناسک، مہاراشٹر**

آپ کی زیر نگرانی "اردو دنیا" کامیابی کی راہ پر گامزن ہے اور خوب سے خوب تر ہوتا جارہا ہے۔ اس کے توسط سے معیاری مضامین اردو عوام تک پہنچ رہے ہیں۔

مارچ 2004 کا "اردو دنیا" اس وقت سامنے ہے۔ رسالے کی پہلی ہی تصویر یہ ثبوت دے رہی ہے کہ آپ اردو میں مذہب کے فرق کو کم کرتے جارہے ہیں۔ اس شمارے کے تمام مضامین قابلِ تعریف ہیں، خاص طور سے باربرا ڈی. مٹکاف کا فروری 2002 میں دیا ہوا لیکچر بہت پسند آیا۔ مگر حیرت اس بات پر ہوئی کہ فروری 2002 میں اردو پر دیا جانے والا یہ لیکچر اردو دنیا میں پورے دو سال بعد شائع ہوا۔ ایک حقیر مشورہ یہ دینا تھا کہ صحافت کے لیے ایک گوشہ مختص کیا جائے جس میں ہندستان بھر سے شائع ہونے والے اردو اخبارات و رسائل کا حال درج ہو۔

**"اردو دنیا" میں ایسے مضامین شائع کیے جاتے ہیں جو اہم موضوعات پر تحریر کیے گئے ہوں اور اپنے موضوع کا مکمل احاطہ کرتے ہوں، اچھی تحریر زماں و مکاں کی قیود سے آزاد ہوتی ہے۔ باربرا ڈی. مٹکاف کی تقریر آج بھی اتنی ہی بامعنی ہے جتنی کہ 2002 میں تھی۔**

**ادارہ**

■ **حمیر جہاں، محمد مصطفےٰ، تعلیم الدین ڈگری کالج، مئوناتھ بھنجن، یوپی**

"اردو دنیا" نے اپنا ایک خاص مقام بنالیا ہے اور قارئین کو اس کا شدت سے انتظار رہتا ہے۔ گوشۂ ادب میں آپ نے جو سید محمد اشرف کا افسانہ "بادِ صبا کا انتظار" (اپریل 2004) شائع کیا ہے اس سے بہت متاثر ہوں۔

میرے بڑے بھائی دہلی میں پڑھتے ہیں۔ ان کے ذریعے مجھے ہر مہینے کا "اردو دنیا" پڑھنے کو مل جاتا ہے۔ یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ قومی اردو کونسل کے صدر دفتر کا سنگِ بنیاد، جسولہ۔ دہلی میں رکھا گیا ہے۔ اس کے لیے میں قومی اردو کونسل کو مبارکباد پیش کرتی ہوں اور خدا سے دعا کرتی ہوں کہ "اردو دنیا" ترقی کی منزلوں پر ہمیشہ آگے بڑھتا رہے۔

■ **مفتی انصار احمد قاسمی، مدرس مدرسہ فیض العلوم، برہانپور، ایم. پی**

ماہنامہ "اردو دنیا" پابندی سے پڑھتا ہوں۔ بڑا ہی معیاری پرچہ ہے اور اس زمانے میں اردو کی خدمت کا بہت بڑا کام انجام دے رہا ہے۔ خصوصاً آپ نے کتاب میلے کا جو سلسلہ شروع کیا ہے وہ قابلِ مبارکباد اور لائقِ تحسین ہے۔ سری نگر اور ممبئی کے کتاب میلوں کی رپورٹ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ سب سے زیادہ خوشی اس بات کی ہے کہ اس مہنگائی کے زمانے میں بھی قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان سستے داموں پر کتابیں فروخت کررہی ہے جو اردو کی بہت بڑی خدمت ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی اس خدمت کو قبول فرماکر نظرِ بد سے حفاظت فرمائے۔

■ **ظہیر غازی پوری، ہاشمیہ کالونی، ہزاری باغ، جھارکھنڈ**

میں "اردو دنیا" کے ذریعے اردو زبان و ادب کی تازہ ترین صورت حال سے واقف ہوا۔ خصوصیت سے رفیق زکریا، راجندر یادو اور شیبا فہمی کے مضامین نے معلومات میں اضافہ کیا۔ راجندر یادو کے مضمون یا اداریے کا جواب شیبا فہمی نے معروضی اور استدلالی انداز میں لکھا ہے مگر بعض نکات پر ابھی اور بہت کچھ لکھنے کی ضرورت ہے۔ حیرت اس بات پر ہے کہ راجندر یادو جیسے ذمّے دار اہلِ قلم بھی حقائق سے چشم پوشی کے مرتکب ہونے لگے ہیں جبکہ فن کار چاہے کسی زبان کا ہو، اسے ایماندار ہونا چاہیے۔

■ **بھگوان داس اعجاز، ٹی-451، بلجیت نگر، نئی دہلی**

"اردو دنیا" جون 2004 حسبِ معمول بروقت ملا، شکر گزار ہوں۔ ورق گردانی کی تو نظر ابرار رحمانی کے مضمون "مسندِ خاک کا شاعر" پر پڑی۔ عرفان صدیقی کے کئی اشعار نے متاثر کیا، ان کی غزلیں بھی اچھی ہیں اور یہ شعر ؎

یہ درد ہی مرا چارہ ہے تم کو کیا معلوم
ہٹاؤ ہاتھ میں بیمار رہنا چاہتا ہوں

پڑھ کر لگتا ہے کہ یہ ذکر کسی حکیم یا وید کی قربت کا ہے جو نبض پر اپنی انگلیاں رکھ کر مرض کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کررہا ہے۔ اب شہروں میں تو کہیں یہ منظر نظر نہیں آتا۔ مشینیں ہی مرض کی تشخیص کرتی ہیں اور ٹیسٹ ہی ٹیسٹ میں بیمار کے برتن بک جاتے ہیں۔ ایک اور شعر میں پگڑی کا ذکر ہے ؎

اک ذرا خم ہو کے میں پیشِ ستمگر بچ گیا
میری پگڑی گر گئی لیکن میرا سر بچ گیا

ہاں! میر کا شعر یاد آرہا ہے ؎

پگڑی اپنی سنبھالیے گا میر
اور بستی نہیں یہ دلّی ہے

جانے والوں کو میرا بھی سلام پہنچے!

■ **علیم صبا نویدی، چیف ایڈیٹر، 26، امیر النسا بیگم اسٹریٹ، چنئی**

تازہ شمارے میں گوشۂ ادب کا حصہ بڑا جاندار اور وقیع ہے۔ گوشۂ فروغِ کتب میں اتر پردیش کے لوک گیت والا مضمون بڑا معلوماتی ہے۔ اس بار علی محمد خسرو، مخمور سعیدی، علی احمد فاطمی اور عبید الرحمان کے مضامین نے "اردو دنیا" کی پیشانی میں روشن بندیا لگائی ہے اور اس روشن بندیا کی آب و تاب یقیناً قابلِ دید ہے۔

■ **محمد فیروز اختر، مہابیر گنج، رفیع گنج، اورنگ آباد، بہار**

بچوں کا گوشہ جس کے ذریعے رابندر ناتھ ٹیگور کے حالاتِ زندگی کا پتہ چلتا ہے، طالب علموں کے لیے معلومات افزا ہے۔ میں خود اردو کا طالب علم ہوں۔ اس رسالے کے ذریعے اردو دنیا کی پوری خبریں مل جاتی ہیں۔ چھوٹے شہروں میں اس کے علاوہ کوئی ذریعہ نہیں جس سے اردو کی جانکاری مل سکے۔ یہ مکمل ادبی، علمی اور اطلاعاتی رسالہ ہے۔ مجھے بے صبری سے اس کا انتظار رہتا ہے۔

# ہماری بات

کسی بھی ملک کی ہمہ جہت ترقی کے لیے لازمی ہے کہ اس کے تمام باشندے معاشی طور پر مطمئن اور تعلیمی طور پر ترقی یافتہ ہوں۔ یہ ہمارے ملک کی بدقسمتی ہے کہ اس کے عوام کی ایک بڑی تعداد آج بھی خط افلاس سے نیچے زندگی بسر کر رہی ہے اور صد فیصد خواندگی کا خواب بھی اب تک شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکا ہے۔ اقلیتوں خصوصاً مسلمانوں کی معاشی حالت کچھ زیادہ ہی خراب ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ زیادہ تر مسلمان ناخواندگی کا شکار ہیں۔ یہ امر باعثِ مسرت ہے کہ کانگریس کی قیادت میں متحدہ ترقی پسند محاذ حکومت نے اقلیتوں کی فلاح و بہبود اور ان کی تعلیمی ترقی کی طرف سنجیدگی سے توجہ منعطف کی ہے۔ متحدہ ترقی پسند محاذ نے اقلیتوں کی فلاح و بہبود اور ان کی تعلیمی ترقی کے لیے اپنے کم از کم مشترکہ پروگرام میں مندرجۂ ذیل امور پر زور دیا ہے۔

1. متحدہ ترقی پسند محاذ مرکزی یونیورسٹیوں سے اقلیتی تعلیمی اداروں کی براہِ راست وابستگی کے امکان کا جائزہ لینے کے لیے ایک کمیشن قائم کرے گا۔ کمیشن اگر ضروری سمجھے گا تو اس مقصد کے لیے آئین ہند میں ترمیم کی سفارش بھی پیش کرنے کا مجاز ہوگا۔

2. اقلیتی فرقوں میں جدید اور تکنیکی تعلیم کے فروغ پر متحدہ ترقی پسند محاذ خصوصیت سے دھیان دے گا اور اقلیتوں کے سماجی اور اقتصادی امپاورمنٹ کے لیے تعلیم اور روزگار میں رزرویشن سمیت ان کی فلاح و بہبود کو اہمیت دے گا۔

3. متحدہ ترقی پسند محاذ آئین کی دفعہ 345 اور 347 کے تحت اردو زبان کی حیثیت کو تسلیم کرنے اور اسے فروغ دینے کی کوشش کرے گا۔

ان نکات پر مؤثر عمل درآمد کے لیے بہت سوچ سمجھ کر منصوبہ بند انداز میں قدم اٹھانے کی ضرورت ہے۔ اسی مقصد کے تحت حکومتِ ہند کی وزارت ترقی انسانی وسائل نے ''اقلیتوں کی فلاح و بہبود اور تعلیم پر گفتگو'' کے عنوان سے دو روزہ کانفرنس 3 اور 4 رجولائی 2004 کو بالترتیب وگیان بھون اور سمراٹ ہوٹل میں منعقد کی تاکہ ملک کی تمام اقلیتوں کے نمائندوں سے گفت و شنید اور صلاح و مشورہ کر کے ان کی باہمی رائے سے اقلیتوں کی فلاح و بہبود اور ان کی تعلیمی ترقی کے لیے ایک بہتر اور قابلِ نفاذ لائحۂ عمل مرتب کیا جا سکے۔ اس کانفرنس میں مسلمانوں، سکھوں، عیسائیوں، جینوں، بودھوں اور ملک کی دیگر تمام اقلیتوں سے تعلق رکھنے والے دانشور، ماہرین تعلیم، سماجی کارکن، ادیب اور سیاست داں حضرات شریک ہوئے۔

کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے وزیر اعظم ہند ڈاکٹر منموہن سنگھ نے تعلیم سے متعلق جو اظہار خیال کیا اس سے صاف واضح ہے کہ وہ ملکی آبادی کے تمام حصوں کی تعلیمی ترقی کو کتنی اہمیت دیتے ہیں۔ ان کا یہ خیال کہ ''تعلیم صلاحیتوں میں اضافہ کرتی ہے اور انسان کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے میں مدد کرنے کے ساتھ ساتھ سماج کی پیداواری صلاحیتوں کو بھی بڑھاتی ہے'' مبنی بر حقیقت ہے اور اگر ہمیں اپنے ملک کو ترقی یافتہ ممالک کی صف میں شامل کرنا ہے تو تعلیم پر خصوصی توجہ لازمی طور پر دینی ہوگی۔ یہ امر خوش آئند ہے کہ حکومت نے مجموعی گھریلو پیداوار (جی. ڈی. پی.) کا 6 فیصد تعلیم پر خرچ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے ملک کے دیگر عوام کے ساتھ ساتھ اقلیتی طبقوں کو بھی فائدہ پہنچے گا۔ حکومت ماضی میں بھی تعلیمی طور پر پس ماندہ اقلیتوں کا تعلیمی معیار بہتر بنانے کے لیے کئی اسکیمیں چلاتی رہی ہے جیسے ایریا انٹینسو پروگرام، مدارس کی جدیدکاری وغیرہ۔ امید ہے کہ اب ان پروگراموں میں مزید تیزی آئے گی اور اقلیتوں کی تعلیمی ترقی کے نئے امکانات سامنے آئیں گے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اقلیتی طبقوں نے اپنے طور پر تعلیم کے پھیلاؤ کی جو کوششیں کی ہیں، انھیں سرکاری اسکیموں سے جوڑا جائے تاکہ اس سمت میں زیادہ تیز رفتار سے بامعنی نتائج حاصل کیے جا سکیں۔

وزیر اعظم نے اپنی تقریر میں ایک اور اہم بات یہ کہی کہ ''ہماری حکومت اردو کے فروغ پر زور دے گی جس سے مجھے ذاتی طور پر لگاؤ ہے۔'' متحدہ ترقی پسند محاذ کے کم از کم مشترکہ پروگرام میں بھی آئین کی دفعات 345 اور 347 کے تحت اردو زبان کو تسلیم کرنے اور اسے فروغ دینے کی بات کہی گئی ہے۔ اس سیاق میں امید ہے کہ سہ لسانی فارمولے کے تحت اردو مادری زبان والے بچوں کو اردو بہ طور پہلی زبان پڑھنے کا موقع ملے گا اور اس طرح ان کی صلاحیتوں کو زیادہ بہتر طور پر ابھرنے کا موقع ملے گا۔

کئی ریاستوں میں اقلیتوں نے کئی بڑے تکنیکی تعلیمی ادارے قائم کیے ہیں جن سے طلبہ استفادہ کر رہے ہیں لیکن قومی یونیورسٹیوں سے الحاق نہ ہونے کی وجہ سے انھیں کئی طرح کی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ حکومت کی طرف سے اقلیتی پیشہ ورانہ اداروں کو مرکزی یونیورسٹیوں سے ملحق کیے جانے کے بعد ان دقتوں پر قابو پایا جا سکے گا اور جہاں ایک طرف ایسے اداروں کے تعلیم یافتہ افراد کو روزگار حاصل کرنے میں آسانی ہوگی وہیں دوسری طرف بغیر کسی اضافی خرچ کے اقلیتی طبقوں کے تکنیکی اور پیشہ ورانہ تعلیمی اداروں کے ذریعے اقلیتوں کی تعلیمی ترقی کا نشانہ حاصل کرنے میں بھی آسانی ہوگی۔

مرکزی وزیر برائے ترقی انسانی وسائل جناب ارجن سنگھ نے کانفرنس کے اختتام پر دو اہم اعلانات کیے اوّل تو یہ کہ اقلیتی تعلیمی اداروں کے مسائل کے بروقت حل کے لیے وزارت ترقی انسانی وسائل میں ایک الگ یونٹ قائم کیا جائے گا اور دوئم یہ کہ حکومت تمام پہلوؤں پر غور کر کے چار ماہ میں اقلیتوں کی تعلیمی ترقی کے لیے ایک واضح لائحۂ عمل طے کرے گی اور اس پر سنجیدگی سے عمل درآمد کیا جائے گا۔

حکومت اپنی طرف سے کوششیں کر رہی ہے، اقلیتوں خصوصاً مسلمانوں (جو تعلیمی طور پر سب سے زیادہ پس ماندہ ہیں) کو بھی اپنی تعلیمی پس ماندگی دور کرنے اور نئے دور کی نئی ٹیکنالوجی کی نئی سوغاتوں سے بہرہ ور ہونے کے لیے اپنے طور پر کوششیں کرنی ہوں گی تبھی ان کی تعلیمی پس ماندگی دور ہو پائے گی اور وہ ملک کی تعمیر و ترقی میں اپنا مؤثر رول ادا کر سکیں گے۔

ڈاکٹر منموہن سنگھ

گیسٹ کالم

# اقلیتوں کی فلاح و بہبود اور تعلیم

دوستو!

آج آپ کے درمیان آکر مجھے بے حد خوشی ہو رہی ہے۔ خصوصاً ایک ایسی کانفرنس میں شرکت میرے لیے باعثِ مسرت ہے جس کا مقصد فلاح و بہبود کو تعلیم سے جوڑنا ہے۔ یہ تقریباً ایک بدیہی امر ہے کہ یہ سارے مسائل باہم دیگر مربوط ہیں۔ مگر میری نسل کے لیے ان مسائل کا تعلق ہمارے ذاتی تجربات سے ہے۔ مثلاً میں ذاتی طور سے مطمئن ہوں کہ مجھے اچھی تعلیم دی گئی جس نے مجھے مغربی پنجاب کے ایک دیہی علاقے میں میرے بچپن کی معاشی اور سماجی حالت سے بالاتر ہونے کے قابل بنایا۔

جیسا کہ میرے عزیز دوست امرتیہ سین اکثر کہا کرتے ہیں کہ تعلیم میں صلاحیت پیدا کرنے اور انسان کو مقتدر بنانے کی فطری قوت ہے۔ تعلیم انسان کو امپاور کرتی ہے۔ بیسویں صدی میں تعلیم کے عام ہونے سے دنیا بھر کے لاکھوں لوگوں کی خوشحالی میں اضافہ ہوا ہے۔ مرحوم محبوب الحق کہا کرتے تھے کہ ''ترقی کا بنیادی مقصد لوگوں کی خواہشات کی تکمیل ہے۔'' صلاحیتیں بہتر بنائے بغیر آپ کیسے لوگوں کی خواہشات کی تکمیل کر سکتے ہیں؟

مجھے اس بات کا یقین ہے کہ تعلیم تک رسائی سماجی مساوات کا اہم ترین وسیلہ ہے۔ اگر ترقی محض اعداد و شمار کا کھیل نہیں ہے اور اگر معاشی نشوونما کا تعلق عوام سے ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں بذریعۂ تعلیم امپاورمنٹ پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ متحدہ ترقی پسند محاذ (United Progressive Alliance) کے کم از کم مشترکہ پروگرام (CMP) میں تعلیم پر بے حد زور ہے۔ البتہ یہ سمجھنا ضروری ہے کہ تعلیم پر خرچ کی جانے والی رقم کا تعلق صرف فلاح سے نہیں ہے بلکہ یہ امپاورمنٹ کا بھی ایک اہم ذریعہ ہے۔ متحدہ ترقی پسند محاذ کے کم از کم مشترکہ پروگرام میں یہ بات صراحتاً تسلیم کی گئی ہے کہ اقلیتوں کا سماجی و معاشی امپاورمنٹ متحدہ ترقی پسند محاذ کا ترجیحی معاملہ ہوگا اور ان کی تعلیم اور امپاورمنٹ پر منظم طور پر توجہ دی جائے گی۔ دوستو! میں اس فکر کو آگے بڑھانے میں مضبوط قدم اٹھاؤں گا۔

تعلیم درحقیقت صلاحیت میں استحکام پیدا کر کے کسی معاشرے کی تخلیقی قوت میں اضافہ کرتی ہے۔ یہ قطعاً تعجب کی بات نہیں کہ ہر جدید صنعتی معیشت کی شرح خواندگی 80فی صد سے زائد ہے۔

تعلیم، صلاحیت پیدا کرنے اور فرد اور معاشرے کے سماجی و معاشی سرمائے کو بڑھانے میں مدد دیتی ہے۔ ہمارے ملک کے مختلف خطوں اور قومیتوں کے درمیان موجود تفاوت کی کم از کم جزوی وضاحت تک رسائی، تعلیم کے بدلتے ہوئے درجات سے ہوسکتی ہے۔ اسی لیے لوگوں کی تعلیمی استعداد کی سطح بہت واضح طور پر ان کی معاشی و سماجی حیثیت کا ایک اہم اور لازمی عنصر ہے۔

لہٰذا میں کانفرنس کو ایسے خیالات پیش کرنے کی تاکید کرتا ہوں جو ہمیں ملک گیر سطح پر اقلیتوں کی تعلیمی استعداد کو بڑھانے کے قابل بنا سکتے ہوں تاکہ ان کا سماجی و معاشی امپاورمنٹ ممکن ہو سکے۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں ملازمت کے مواقع سے متعلق مسائل کا جائزہ لینے کے لیے تعلیم کی فراہمی کے سوال سے اوپر اٹھنے کی بھی ضرورت ہے۔ مجھے اس بات کا دکھ ہے کہ پرائیویٹ سیکٹر ہو یا گورنمنٹ سیکٹر، زندگی کے تمام شعبوں میں اقلیتوں کی نمائندگی برائے نام ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ سامعین کو ایسے مسئلے کی سنگینی سے آگاہ کرنے کی ضرورت ہے، جو ایک inclusive معاشرہ بنانے کی ہماری اجتماعی کوشش میں مانع ہوتا ہے، سبھی کو حاصل ہو۔ ایک ایسا معاشرہ جہاں معاشی ترقی کا فائدہ سبھی کو حاصل ہو۔ اس مسئلے کی سنگینی کی وجہ ہر میدان میں اقلیتوں کی معمولی نمائندگی اور تعلیم کی کمی ہے۔ ایک معاملہ جس پر آپ کی توجہ مطلوب ہے، وہ اس مسئلے کو سلجھانے کے لیے مؤثر طریقے تلاش کرنے کا سوال ہے۔ کچھ لوگوں نے اس کے پیشِ نظر وسائلِ تعلیم میں اضافے کے لیے چند مفید اقدامات کیے ہیں۔ اب ہمیں یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ کیا ہم اقلیتی گروپوں کی فلاح و بہبود کے لیے جاری ان عوامی کوششوں کو حکومت کے موجودہ منصوبوں سے جوڑ سکتے ہیں۔ اس لیے میں آپ سے سوال کرتا ہوں کہ کیا ایک مناسب عوامی حصے داری اس فورم سے ابھر کر آسکتی ہے؟

اس قسم کا حل جو ایک طبقے کی کوششوں اور حکومت کی پیش قدمیوں کو باہم دیگر جوڑتا ہے، اس کی اہمیت پر زیادہ زور نہیں دیا جا سکتا۔ تعلیمی ادارے، ابتدائی حفظانِ صحت اور خاندانی خوشحالی جیسے دیگر اہم سماجی مقاصد کو فروغ دینے کے لیے، بطور ذرائع مؤثر انداز سے استعمال کیے جا سکتے ہیں۔ ان اداروں کا استعمال آبادی کے ایسے حصوں کو مرکزی حکومت کی طرف سے بہتر

● وزارتِ ترقی انسانی وسائل نے اقلیتوں کی فلاح و بہبود اور ان کی تعلیمی ترقی سے متعلق صلاح و مشورہ کرنے اور ایک بہتر لائحہ عمل بنانے کے لیے 3 اور 4 /جولائی 2004 کو بالترتیب وگیان بھون اور سمراٹ ہوٹل میں ''اقلیتوں کی فلاح و بہبود اور تعلیم'' کے زیرِ عنوان ایک کانفرنس منعقد کی۔ اس موقعے پر وزیرِاعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ نے کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے ایک بے حد مؤثر اور بامعنی خطبہ پیش کیا جسے قارئینِ ''اردو دنیا'' کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔

خدمات مہیا کرنے کے لیے بھی ہوسکتا ہے جو سہولیات سے محروم ہیں، جیسے اقلیتی طبقے کی عورتیں اور لڑکیاں۔

ہم اپنی جانب سے آپ کو یہ یقین دلاتے ہیں کہ متحدہ ترقی پسند محاذ کی حکومت ان تمام رکاوٹوں کو منظم انداز سے ختم کرے گی جو نہ صرف اقلیتوں کے امپاورمنٹ میں مانع ہوتی ہیں بلکہ درج فہرست ذاتوں اور درج فہرست قبائل کی ترقی میں بھی حائل ہوتی ہیں۔ اس سیاق میں جیسا کہ میں نے کہا ہے، کم از کم مشترکہ پروگرام خاص طریقے اختیار کرنے کا ہم سے وعدہ کرتا ہے۔ مثال کے طور پر اقلیتی تعلیمی اداروں کے لیے ایک کمیشن قائم کرنے کی ہماری تجویز ہے جو مرکزی یونیورسٹیوں سے اقلیتی پروفیشنل اداروں کا براہ راست الحاق کرے گا۔ ہم تمام اقلیتوں کے درمیان جدید اور تکنیکی تعلیم کو فروغ دیں گے۔ مذہبی ولسانی اقلیتوں کے سماجی و معاشی اعتبار سے پسماندہ طبقوں کی خوشحالی کے لیے ہم ایک قومی کمیشن بھی قائم کریں گے، ساتھ ہی ساتھ تعلیم و ملازمت میں انھیں ریزرویشن بھی دیں گے۔ قومی اقلیتی ترقیاتی اور مالیاتی کارپوریشن کے لیے اضافی فنڈ دیا جائے گا تاکہ کمیشن اپنا کام مؤثر طور پر کرسکے۔ ہم اردو کے فروغ کے لیے بھی پابندِ عہد ہیں۔ یہ ایک ایسی زبان ہے جس سے مجھے ذاتی لگاؤ ہے۔

مجھے معلوم ہے کہ وزارت ترقی انسانی وسائل تمام اقلیتوں کی تعلیمی استعداد میں بہتری کے لیے بہت سے منصوبوں کا نفاذ کررہی ہے۔ وزیرِ ترقی انسانی وسائل نے ان میں سے چند کا ذکر مختصراً کیا ہے۔ اقلیتوں کے ذریعے چلائے جانے والے اداروں سے متعلق مقدموں پر سپریم کورٹ کے فیصلے کے مطابق وزارت نے ہنگامی حکم (interim order) جاری کیا ہے۔ میرے خیال میں یہ ہم سب کے لیے خاص اطمینان کی بات ہے کہ یہ اہم وزارت آج باصلاحیت اور تجربہ کار ہاتھوں میں ہے۔

مجھے بڑی دلچسپی کے ساتھ اس کانفرنس میں کیے جانے والے غوروخوض اور آپ کی خاص سفارشوں کا انتظار ہے۔ اگر ہمارے جوانوں کے ذریعے مستقبل کو ایک سانچے میں ڈھلنا ہے تو انھیں ہمارے جدید، سیکولر اور بہتر معاشرے کے بانیوں کی دوراندیشی سے رہنمائی حاصل کرنی چاہیے۔ یہاں آج ہم تمام لوگ ایک خاص مقصد کے تحت جمع ہوئے ہیں، ہمیں ایک اہم رول ادا کرنا ہے۔ یہ ایک عظیم ذمّے داری ہے جس پر ہر پہلو سے غوروخوض کرنا ہے۔ میں اس کانفرنس کی کامیابی کے لیے دعا گو ہوں۔

مترجم: نسیم احسن

□□□


**جراثیم**

**مصنف: بی. وی. بیراشین/ مترجم: بشریف احمد خاں**

جراثیم کرۂ ارض پر پائے جانے والے مختلف النوع جانداروں میں بے حد اہم ہیں۔ یہ مفید بھی ہیں اور مضر بھی۔ زندگی اور موت، صحت اور مرض ہر حالت میں جراثیم ہماری زندگی کا اہم جزو ہیں۔ زیرِ نظر کتاب میں جراثیم سے متعلق تفصیلی معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں۔

صفحات: 129، قیمت -/36 روپے

**چٹانیں بولتی ہیں**

**مصنف: وشنو متر/ مترجم: انوار رضوی**

چٹانیں ہماری کائنات کا اہم حصہ ہیں۔ اس کتاب میں زمین کی ابتدا اور ارتقا کے مختلف پہلوؤں سے متعلق بعض ایسے حقائق بیان کیے گئے ہیں جن کا انکشاف چٹانوں کے ذریعے ہوا ہے۔ طالب علموں کی آسانی کے لیے متعدد خاکے اور تصاویر بھی شامل کتاب ہیں۔

صفحات: 65، قیمت: -/21 روپے

**تیز تر اور دور تر (نقل و حمل کی کہانی)**

**مصنف: میر نجابت علی/ مترجم: مہ جبیں اختر**

نقل و حمل انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔ پیٹ بھرنے سے لے کر مختلف افراد سے ملنے اور دیگر ضروریات کے تحت ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا انسان کا شوق بھی ہے اور مجبوری بھی۔ زیرِ نظر کتاب میں ذرائع نقل و حمل کے مسلسل ارتقائی سفر سے واقف کرایا گیا ہے۔

صفحات: 82، قیمت: 28 روپے

**جنگلات کی کاشت**

**مصنف: ایس. کوشاس/ مترجم: مسرت جہاں**

جنگل ہمارے لیے اتنے ہی ضروری ہیں جتنی ندیاں، پہاڑ اور دیگر قدرتی اشیا۔ یہ نہ صرف ماحولیاتی توازن برقرار رکھنے میں معاون ہیں بلکہ کئی اہم صنعتوں کا دارومدار بھی ان پر ہوتا ہے۔ اس کتاب میں مختلف جنگلی درختوں اور جنگل سے متعلق مختلف پہلوؤں سے واقف کرایا گیا ہے۔

صفحات: 95، قیمت: -/24 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

**قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان**

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی

سکینہ یوسف خاں

# مشیرالحسن سے گفتگو

**سوال: کیا آپ یہ مانتے ہیں کہ 1990 کے آغاز میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پرووائس چانسلر کی حیثیت سے آپ نے اپنے عہد میں جس صاف گوئی اور بیباکی سے کام لیا، یہ اس کا بدلہ ہے؟ کیا یہ وائس چانسلر شپ کچھ تاخیر سے ملی ہے؟**

جواب: وائس چانسلر ہونا کسی کا پیدائشی حق نہیں ہے۔ میں اپنی پی. ایچ. ڈی. کے فوراً بعد 1978 میں جامعہ سے منسلک ہوگیا اور اسے چھوڑنے کا کبھی خیال بھی نہیں آیا۔ بیرونِ جامعہ کسی عہدے کے لیے میں نے کبھی کوشش نہیں کی اور میں نہیں سمجھتا کہ میں نے کوئی موقع گنوایا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں محض ایک استاد نہیں بلکہ ایک محقق بھی ہوں۔ میں کتابیں لکھ کر پوری طرح مطمئن تھا۔ ابھی بھی میرا خیال ہے کہ میں کم عمر وائس چانسلروں میں سے ایک ہوں۔ مجھے خوشی ہے کہ ایک موقع آیا ہے اور اسے میں ایک چیلنج کے طور پر قبول کر رہا ہوں۔

**سوال: آپ کے تقرر نے بیورو کریٹس کو وائس چانسلر کی حیثیت سے مقرر کرنے کے جدید رجحان کو پلٹ دیا ہے۔ کیا اکیڈمیشین حضرات کے لیے یونیورسٹیوں کی سربراہی بہتر ہے؟**

جواب: نہ تو سارے اکیڈمیشین دور اندیش ہوتے ہیں اور نہ ہی سارے ایڈمنسٹریٹروں میں دور اندیشی کی کمی ہوتی ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر ایک بیوروکریٹ تھے، انھوں نے اس وژن کو فروغ دیا جو یونیورسٹی کے اعلا مفاد میں تھا۔ انھوں نے جو منصوبے بنائے اور ان پر عمل درآمد شروع کیا اس کا فائدہ ہم لوگوں کو ہوگا۔

**سوال: جامعہ کی مضبوطی اور کمزوری کیا ہے؟**

جواب: سیکولر، غیر متعصب اور روشن خیالی کی اقدار اس کی مضبوطی ہیں اور کمزوریاں ایسے مسائل ہوں گے جن کا تعلق شناخت اور تبدیلی کی مزاحمت سے ہے۔ شکر ہے کہ اس خاص ذہنیت میں تبدیلی آرہی ہے۔

**سوال: جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی کی ایک مرکزی یونیورسٹی ہے۔ مگر یہ دہلی یونیورسٹی اور جواہر لال نہرو یونیورسٹی سے مختلف کیوں ہے؟**

جواب: اکتوبر 1920 میں اس کی تاسیس عمل میں آئی۔ اس وقت سے اس کی تاریخ پیچیدہ رہی ہے۔ بہت سارے اسباب کی بنا پر یہ آزادی کے بعد اپنی وہ پہچان نہیں بنا سکی جس کی حقدار تھی اور نہ ہی اپنے دائرۂ علم کو وسعت دے سکی۔ میرا خیال ہے کہ اس کے لیے کسی کو موردِ الزام قرار دینے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ خود ہمارے اندر عدم موزونیت ہے۔ حالیہ چند برسوں میں اس ادارے کے سلسلے میں کچھ غلط تاثرات دور کیے گئے ہیں۔ مگر اس سمت میں ہمیں مزید کام کرنے کی ضرورت ہے۔ مزید برآں اکیڈمک پروفائل کو بھی بلند کرنا ضروری ہے۔ مثال کے طور پر جامعہ کے Mass communication research centre کو خاصی شہرت ملی ہے کیوں کہ اس کی پرفارمنس بہت اچھی رہی ہے۔ ہمیں لوگوں کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش کرنی ہوگی۔

**سوال: مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کی وجہ کیا ہے؟**

جواب: سرکاری اسکولوں تک رسائی ایک بڑا مسئلہ ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ بہت سارے مسلم خاندان اپنے بچوں خصوصاً اپنی لڑکیوں کو مدارس و مکاتب میں بھیجنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ مسلمانوں کے درمیان تعلیمی فروغ میں ریاستوں کا رول انتہائی ناکافی رہا ہے۔ لیکن جہاں کہیں بھی صوبائی حکومت نے موثر انداز میں مداخلت کی ہے جیسے کیرالہ میں، کسی حد تک کرناٹک میں اور حال میں سابقہ

● **پروفیسر مشیرالحسن نے جون 2004 کے آغاز میں جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے چارج سنبھالا۔ اس سے قبل وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی اکادمی آف تھرڈ ورلڈ اسٹڈیز میں جدید تاریخ ہند کے پروفیسر اور ڈائرکٹر کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے تھے۔ پروفیسر حسن نے ہندوستان میں اسلامیات، تقسیم ہند اور فرقہ وارانہ مسائل کے موضوع پر کئی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ ان کا انٹرویو قارئینِ ”اردو دنیا“ کی نذر ہے۔**

حکومت کے ذریعے مدھیہ پردیش میں، یا ذاتی اقدامات کے ذریعے مواقع فراہم کیے گئے ہیں وہاں مثبت نتائج دیکھنے کو ملے ہیں۔ مسلمانوں کی جو شبیہ پیش کی جاتی ہے کہ وہ تعلیم کے مخالف ہیں، یہ صحیح نہیں ہے۔

**سوال: مین اسٹریم کا حصہ بننے کی مخالفت کے سلسلے میں جو کچھ کہا گیا ہے، کیا یہ تصور بھی غلط فہمی پر مبنی ہے؟**

جواب: پہلے ہمیں یہ طے کرنا ہوگا کہ مین اسٹریم ہے کیا؟ یہ فرض کرلینا کہ مسلمان صرف اس وجہ سے مختلف ہیں کہ وہ ایک جداگانہ مذہب کی پیروی کرتے ہیں ان کے ساتھ ناانصافی ہے۔ وہ ٹھیک اسی طرح مین اسٹریم کا حصہ ہیں جیسا کہ دوسری قومیں۔ میرے خیال میں یہ ایک ایسا سوال ہے جس کو مسترد نہیں کیا جاسکتا۔

**سوال: کیا حکومت کو نئے سرے سے تاریخ نویسی میں مداخلت کرنی چاہیے؟**

جواب: یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر حکومتِ وقت اور ممتاز مورخین کو بحث کرنے کی ضرورت ہے۔ مگر سابقہ حکومت کے ذریعے متعارف کرائی گئی کتابیں نظرِ ثانی کی متقاضی ہیں۔ NCERT کی کتابیں ہی نہیں بلکہ پورے ہندی خطے میں طلبہ کو پڑھائی جانے والی کتابیں بھی بدل دینی چاہئیں کیوں کہ یہ تمام کی تمام زہر آلود ہیں۔ اس ہم آہنگی تک رسائی کے لیے کہ درسی کتابیں ہمارے متنوع اقدار کا آئینہ ہوں ایک کل جماعت کانفرنس بلائی جاسکتی ہے۔

**سوال: کیا درسی کتابیں لکھوانا حکومت کا کام ہے؟**

جواب: اس پر بحث کی شدید ضرورت ہے۔ ایک موزوں مباحثے کے بغیر کوئی بھی فیصلہ قبل از وقت ہوگا۔

**سوال: ایک رائے سامنے آئی ہے کہ گجرات کا قتلِ عام سیکولر تعلیم کی ناکامی کا بین ثبوت ہے؟**

جواب: سیکولرزم لازمی طور پر ایک سیاسی تصور رہا ہے۔ اسے سماجی، ثقافتی اور عقلی اصطلاحوں میں منتقل نہیں کیا گیا ہے۔ بہت سے ایسے وسائل ہیں، صحافت، اسکول، کالج، سیاسی و سماجی تنظیمیں جن کے ذریعے آپ معاشرے کو سیکولر بنا سکتے ہیں۔ ہم نے ان وسائل کا استعمال نہیں کیا ہے۔ نہرو نے 1937 میں جو کچھ کیا تھا وہ ہمیں 2004 میں کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں عوامی رابطے کی ایک مہم چلانی ہے جسے معاشرے کے بڑے حلقے تک پہنچنا ہے اور مشترکہ تمدنی اقدار کی وضاحت کرنی ہے۔ کانگریس، کمیونسٹ اور دیگر مرکزی پارٹیوں جیسے سماج وادی اور بہوجن سماج پارٹی کو چاہیے کہ وہ اپنا کردار پہچانیں جو موجودہ صورتِ حال میں وہ ادا کرسکتی ہیں۔

**سوال: کیا انتظامی ذمے داری آپ کی درسی مصروفیت میں مانع نہیں ہوگی؟**

جواب: انیسویں صدی میں دہلی کے مسلم دانشوروں سے متعلق ایک کتاب پر کام کررہا ہوں۔ میں یقیناً اسے مکمل کروں گا اور دیگر مسائل پر بھی اپنا ردِعمل ظاہر کرتا رہوں گا۔

**(بشکریہ "ٹائمس آف انڈیا" نئی دہلی، 24 رجون 2004)**

مترجم: نسیم احسن

□□□


**اردو ادب کی سماجیاتی تاریخ**

پروفیسر محمد حسن

ادبی سماجیات ایک نئے علم کی حیثیت سے حال ہی میں سامنے آئی ہے۔ یہ کتاب اردو میں ادبی سماجیات کے مطالعے کی پہلی کوشش ہے جو اس کے تمام اہم پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔

پہلی اشاعت

334 صفحات، قیمت: 98.00 روپے

**اردو ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں ترسیل وابلاغ کی زبان**

ڈاکٹر کمال احمد صدیقی

مصنف برسوں تک آل انڈیا ریڈیو میں ذمے دارانہ عہدوں پر رہے ہیں، انھوں نے باریک بینی کے ساتھ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی زبان پر گفتگو کی ہے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے قلم کاروں کے لیے یہ کتاب خصوصی افادیت رکھتی ہے۔

پہلی اشاعت

646 صفحات، قیمت: 200.00 روپے

**اردو ڈراموں کا انتخاب**

مرتب: پروفیسر محمد حسن

1947ء سے 1990 تک اردو میں لکھے جانے والے ڈراموں کا ایک نمائندہ انتخاب جن میں تاریخی، نیم تاریخی، سماجی اور سراسر تخیلی ڈرامے بھی شامل ہیں۔ ابتدا میں فاضل مرتب نے ڈرامے کے فن اور اس کی روایت پر بھرپور گفتگو کی ہے۔

پہلی اشاعت

600 صفحات، قیمت: 156.00 روپے

**نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔**

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

مخمور سعیدی

دوسری اور آخری قسط

# آزادی کے بعد اردو کی ادبی صحافت — دلّی میں

ماہنامہ ''پیش رفت'' گزشتہ گیارہ سال سے شائع ہو رہا ہے۔ یہ ادب میں تعمیری قدروں کی ترجمانی کا دعویدار ہے۔ پہلے اس کے ایڈیٹر عزیز بگھروی تھے، اب یہ ڈاکٹر سید عبدالباری کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے اور اس کے مدیر منتظم انتظار نعیم ہیں۔ مجلس مشاورت میں کئی مشہور اہلِ قلم شامل ہیں اور یہ سب اپنی اسلام پسندی کے لیے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ رسالے کا علمی انداز اور ادبی معیار پڑھنے والوں کو متوجہ بھی کرتا ہے اور متاثر بھی۔ رسالے کا دفتر بلی ماران کے علاقے بارہ دری میں ہے۔

ایک ماہانہ رسالہ ''عصری آگہی'' کے نام سے پروفیسر قمر رئیس کی ادارت میں نکلا تھا۔ بشیر احمد ان کے شریک کار تھے۔ ترقی پسند نظریۂ ادب کا ترجمان تھا۔ بعد میں دو ماہی ہوگیا۔ اب پندرہ روزہ ہوگیا ہے اور مجلس ادارت میں قمر رئیس کا نام نہیں ہے۔ بشیر احمد نے ایک رسالہ ''چنگاری'' کے نام سے بھی نکالا تھا، ماہانہ تھا مگر باقاعدگی سے شائع نہیں ہوتا تھا۔ یہ ادبی قضیوں سے زیادہ سروکار رکھتا تھا اور اسی لیے دلچسپی سے پڑھا جاتا تھا۔ اب کافی مدت سے اس کی اشاعت موقوف ہے۔ ہندی ماہنامے ''سریتا'' کے ادارے سے اسی نام سے اردو میں بھی رسالہ نکالا گیا تھا۔ رسالہ خوش نما تھا، بلاک پر چھاپا جاتا تھا لیکن اس کے بیشتر مندرجات ہندی ''سریتا'' سے ماخوذ ہوتے تھے جن کے موضوعات بھی اور فنکار بھی اردو قارئین کے لیے اجنبی اجنبی سے تھے۔ ادارے میں من موہن تلخ اور راجیند رانجم بھی تھے۔ انھوں نے اپنے بس بھر رسالے کو اردو قارئین کے مزاج کے مطابق بنانے کی کوشش کی لیکن وشوناتھ جی جو دونوں رسالوں کے مالک تھے، دونوں رسالوں میں یکسانیت پر زور دیتے تھے۔ اردو قارئین اب ہندی کے فنکاروں سے بخوبی واقف ہیں اور ان کی تحریریں دلچسپی سے پڑھنے لگے ہیں لیکن اس وقت صورت حال مختلف تھی۔ رسالہ ڈیڑھ دو سال نکلا پھر بند ہوگیا۔

دہلی سے نکلنے والے ادبی ماہناموں میں سرکاری رسالے بھی ہیں۔ ان میں قدیم ترین ''آجکل'' ہے جو آزادی کے پہلے سے نکل رہا ہے۔ یہ رسالہ شروع میں ہفت روزہ تھا، پھر پندرہ روزہ ہوا اور اب ماہانہ ہے۔ آزادی کے بعد کچھ برس تک اس کے آخری صفحات ادبِ اطفال کے لیے مخصوص تھے لیکن پھر یہ صفحات حذف کر دیے گئے۔ اس کے ایڈیٹروں میں کئی مشہور فنکار رہے ہیں۔ محمد یعقوب دواشی، سید وقار عظیم، طالب دہلوی، عرش ملسیانی، جگن ناتھ آزاد، مہدی عباس حسینی، شہباز حسین، راج نرائن راز، محبوب الرحمٰن فاروقی اور ابرار رحمانی۔ جوش ملیح آبادی بھی اس کے ایڈیٹر رہے ہیں۔ موجودہ ایڈیٹر عابد کرہانی ہیں جو مشہور شاعر شمیم کرہانی مرحوم کے فرزند اور خود ایک خوش فکر شاعر ہیں۔ رسالہ حکومت ہند کے پبلی کیشنز ڈویژن کے زیر اہتمام شائع ہوتا ہے۔

''آجکل'' معیاری ادبی رسالہ ہے۔ شہباز حسین اور راج نرائن راز کے زمانۂ ادارت میں مختلف عنوانات پر اس کے جو خاص نمبر نکلے انھیں پڑھنے والوں میں غیر معمولی پذیرائی حاصل ہوئی، جدید نظم نمبر اور میر تقی میر نمبر کی مانگ تو اب تک باقی ہے۔ محبوب الرحمٰن فاروقی کے زمانۂ ادارت میں ان کے بعض اداریوں کی وجہ سے یہ ایک تنازعے کی زد میں بھی آیا اور پھر اس کی اشاعت موقوف کر دیے جانے کی افواہیں بھی پھیلیں جو بے بنیاد ثابت ہوئیں۔ مختلف ہندستانی زبانوں کے عصری ادب سے اردو والوں کو باخبر کرانا اس رسالے کی خصوصیت رہی ہے۔

''ایوانِ اردو'' دلّی اردو اکادمی کا ماہانہ رسالہ ہے۔ یہ سید شریف الحسن نقوی کی سکریٹری شپ کے زمانے میں اس وقت جاری ہوا جب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر اکادمی کے وائس چیئرمین بنے۔ اس کی ادارتی ذمّے داری مجھے سونپی گئی۔ یہ رسالہ اپنے آغاز ہی سے اچھے ادبی رسائل میں شمار ہونے لگا اور اس کی کچھ خصوصی اشاعتوں نے تو دھوم مچا دی، مثلاً مولانا ابوالکلام آزاد نمبر، پنڈت جواہر لال نہرو نمبر اور جدید ہندی ادب نمبر۔ ابوالکلام آزاد نمبر میں پہلی بار مولانا آزاد کے وہ نوٹ جو انھوں نے سرکاری فائلوں پر حکومتِ ہند کے وزیر تعلیم کی حیثیت سے لکھے تھے، شائع ہوئے۔ یہ نوٹ اردو میں تھے اور آئی سی سی آر کے اس وقت کے سکریٹری جناب گلزار احمد کی وساطت سے حاصل ہوئے تھے۔ ابوالکلام آزاد نمبر دس دس ہزار کی تعداد میں دو بار چھپا، پھر بھی اس کی مانگ باقی رہی۔ کبھی کبھار میری آزاد خیالی کی وجہ سے مخصوص ادبی ترجیحات رکھنے والے بعض زعمائے ادب نے ''ایوانِ اردو'' کی لگام کسنے کی بھی کوشش کی مگر ایسی کوئی کوشش کامیاب نہ ہوسکی۔ اس کے موجودہ ایڈیٹر دہلی اردو اکادمی کے سکریٹری سیّد مرغوب حیدر عابدی اور اسسٹنٹ ایڈیٹر متور امروہوی ہیں۔ اپنی سکریٹری شپ کے زمانے میں سید اشتیاق عابدی، زبیر رضوی اور ڈاکٹر صادق بھی اس کے ایڈیٹر رہے ہیں۔

ماہنامہ ''اردو دنیا'' قومی اردو کونسل کی طرف سے شائع ہوتا ہے۔ پہلے اس کی نوعیت کونسل کے خبرنامے کی سی تھی اور اس کی اشاعت میں بھی باقاعدگی نہیں تھی۔ اردو کونسل کے موجودہ ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ نے جب اپنی

منصبی ذمے داریاں سنبھالیں اور اردو کونسل کو ایک فعال اردو ادارے کی شکل دی تو اس رسالے کی بھی کایا کلپ ہوگئی۔ اب یہ ہندستان سے نکلنے والا اپنی نوعیت کا واحد اردو ماہنامہ ہے جس کا بنیادی مقصد اردو اور اردو والوں کو عصری تقاضوں سے باخبر اور ہم آہنگ کرنا ہے۔ اس میں ہندستان کے کونے کونے میں ہونے والی علمی، ادبی اور تعلیمی سرگرمیوں کا ذکر بھی ہوتا ہے جو اس کے پندرہ سولہ صفحات کا احاطہ کرتا ہے۔ اہم شخصیتوں کے انٹرویو، اہم کتابوں پر تفصیلی تبصرے اور عصری مسائل و موضوعات پر خیال انگیز مضامین کے علاوہ قارئین کے خطوط بھی اس کی خصوصیت ہیں۔ دوسری زبانوں کی منتخب تحریروں کے تراجم بھی اس میں تواتر سے شائع ہوتے ہیں۔ اس کی تعداد اشاعت اردو کے معروف ادبی رسائل سے کہیں زیادہ ہے جس سے یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اردو کے قارئین ادب کے علاوہ ان موضوعات میں بھی دلچسپی لینے لگے ہیں جو ان کی عملی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ اردو ادب وصحافت کے لیے ایک اچھا شگون ہے۔ فیروز عالم اس کے نئے معاون مدیر ہیں جو اردو کے ایک تازہ دم قلم کار ہیں۔

عام ڈگر سے ہٹ کر ایک رسالہ ''اردو بک ریویو'' ہے جس کے مالک اور مدیر عارف اقبال ہیں۔ اس کا ہر شمارہ اردو کی نئی مطبوعات کے تبصرہ و تعارف پر مشتمل ہوتا ہے۔ مختلف کتابوں پر تبصرے مختلف تبصرہ نگار کرتے ہیں۔ زیادہ تر تبصرے تفصیلی ہوتے ہیں لیکن کچھ تبصروں کی نوعیت محض تعارفی بھی ہوتی ہے۔ تبصروں میں مذہبی نوعیت کی کتابوں کو اولیت دی جاتی ہے، اگر دوسری کتابوں کو بھی برابر کی اہمیت دی جائے تو رسالے کی افادیت دو چند ہوسکتی ہے— اس نوعیت کا ایک رسالہ گزشتہ صدی کی ساتویں دہائی میں ڈاکٹر خلیق انجم اور ڈاکٹر اسلم پرویز کی مشترکہ کوشش سے ''ادبی تبصرے'' کے نام سے نکلا تھا مگر اس کے چار شمارے ہی نکل سکے تھے۔ اس کی مجلس ادارت میں پروفیسر قمر رئیس، پروفیسر صدیق الرحمان قدوائی اور ڈاکٹر شریف احمد کے نام بھی تھے۔

دلّی سے دو ماہی اور سہ ماہی ادبی رسالے بھی نکلتے رہے ہیں۔ ان میں ایک اہم رسالہ ''سطور'' تھا۔ یہ کمار پاشی نے نکالا تھا اور انھیں راقم الحروف اور راج نرائن راز کا تعاون حاصل تھا۔ اس کے اجرا کا مقصد جدید ادب بالخصوص جدید شاعری کی تفہیم و ترویج تھا۔ اس رسالے کے لیے میں نے اپنا پہلا تنقیدی مضمون ''غیر آباد علاقوں کا سفر'' کے عنوان سے کمار پاشی کے اصرار پر لکھا تھا جو جدید شاعری کے محرکات اور جدید شعرا کے ذہنی پس منظر پر روشنی ڈالتا تھا۔ مجھے یہ خیال کرکے اب بھی خوشی ہوتی ہے کہ اس مضمون کو پسند کرنے والوں میں پروفیسر آل احمد سرور بھی تھے۔ رسالے کو اپنے وقت کے ممتاز اہلِ قلم کا تعاون حاصل ہوا اور قارئین نے بھی اس کی خوب خوب پذیرائی کی۔ اس کا سائز عام رسالوں سے مختلف تھا جو 20+30/16 سائز کو الٹ پلٹ کر نکالا گیا تھا۔ یہ جدت راقم الحروف کی ذہنی اپج تھی۔ اس رسالے کا پہلا دور تین یا چار شماروں تک محدود رہا۔ کچھ زمانی وقفے سے یہ دوبارہ نکلا اور اس بار اس کے چھ یا سات شمارے نکلے۔ دورِ ثانی میں اس کے کچھ خاص نمبر بھی نکلے جو یک موضوعی تھے اور اپنے موضوع پر خاصے وقیع مواد کے حامل۔

''اردو ادب'' انجمن ترقی اردو (ہند) کا سہ ماہی رسالہ ہے۔ پہلے پروفیسر آل احمد سرور کی ادارت میں، جو انجمن کے اعزازی جنرل سکریٹری تھے، علی گڑھ سے شائع ہوتا تھا۔ ان دنوں انجمن کا دفتر بھی علی گڑھ ہی میں تھا۔ انجمن کا دفتر دلّی منتقل ہوا اور ڈاکٹر خلیق انجم انجمن کے کل وقتی سکریٹری مقرر ہوئے تو یہ ان کی ادارت میں دلّی سے نکلنے لگا۔ شریک مدیر ایم. حبیب خاں تھے۔ اس کی ڈگر وہی تھی جو اردو کے علمی رسالوں کی معروف ڈگر ہے، لیکن جب سے ڈاکٹر اسلم پرویز اس کے ایڈیٹر مقرر ہوئے ہیں، یہ ایک جداگانہ انداز کا رسالہ بن گیا ہے۔ اردو کے علمی اور ادبی ورثے کی بازدید کے ساتھ ساتھ ہمعصر ادبی کوائف کی جانچ پرکھ اب اس کی امتیازی خصوصیت ہے۔

جس زمانے میں خواجہ احمد فاروقی دلّی یونیورسٹی میں اردو شعبے کے صدر تھے، شعبے کی طرف سے انھوں نے ''اردوئے معلّی'' کے نام سے ایک سہ ماہی رسالے کا اجرا کیا تھا۔ یہ باقاعدہ تو نہیں نکلتا تھا لیکن اس کے جو شمارے نکلے اہمیت کے حامل تھے۔ ایک سہ ماہی رسالہ ڈاکٹر محمد حسن بھی ''عصری ادب'' کے نام سے کئی برس تک نکالتے رہے ہیں۔ اس کی اشاعت میں بھی باقاعدگی نہیں تھی، انحصار وسائل کی فراہمی پر تھا۔ رسالہ محمد حسن صاحب کے مخصوص ادبی اور سیاسی نظریات کی ترجمانی کرتا تھا۔ ایک سہ ماہی رسالہ ''تناظر'' کے نام سے بلراج ورما نے نکالا تھا۔ دو تین شمارے ہی منظرِ عام پر آئے تھے۔ اس میں پاکستانی ادب کو زیادہ اہمیت دی جاتی تھی۔

''فکر و تحقیق'' قومی اردو کونسل کا سہ ماہی رسالہ ہے۔ رسالے کا مزاج تحقیقی بھی ہے اور تفتیشی بھی۔ ترجیح ایسے مضامین کی اشاعت کو دی جاتی ہے جو معلومہ حقائق کے نامعلوم گوشوں کو سامنے لاتے ہوں یا علمی مسائل پر غور و فکر کے نئے در وا کرتے ہوں۔ رسالے کو ممتاز اہلِ قلم کا تعاون حاصل ہے۔ اس کی اشاعت میں مکمل باقاعدگی ہے اور یہ ہر تیسرے مہینے اپنے قارئین تک پہنچ جاتا ہے۔ اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ ایڈیٹر ہیں۔ کمال احمد صدیقی اور انوار رضوی اس کی مجلسِ مشاورت میں رہ چکے ہیں۔ ان دنوں مشیر کی ذمّے داری راقم الحروف کے سپرد ہے۔

دلّی سے نکلنے والا ایک سہ ماہی ادبی رسالہ ''قصے'' ہے جس کے مالک و

مدیر انیس امروہوی ہیں۔ اس کا ہر شمارہ بالعموم یک موضوعی ہوتا ہے اور عصری ادبی صورتِ حال کے کسی خاص پہلو کا احاطہ کرتا ہے۔ اشاعت میں باقاعدگی نہیں ہے۔ زبیر رضوی کے "ذہن جدید" کا بھی یہی حال ہے۔ حالانکہ یہ دلچسپی سے پڑھا جانے والا رسالہ ہے اور یہ ادب کے علاوہ دوسری ذہنی سرگرمیوں کا بھی احاطہ کرتا ہے۔ اس کی بعض اشاعتوں کا کافی چرچا رہا۔ ایک سہ ماہی رسالہ علی جاوید "اقدار" کے نام سے نکال رہے ہیں۔ یہ بھی ایک معیاری رسالہ ہے۔

یہاں شاہد ماہلی کے "معیار" اور صلاح الدین پرویز کے "استعارہ" کا ذکر بھی ضروری ہے۔ شاہد ماہلی جواب غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر اور انسٹی ٹیوٹ کے زیرِ اہتمام نکلنے والے جریدے "غالب نامہ" کے ایڈیٹر ہیں، اپنا ذاتی سہ ماہی رسالہ "معیار" بھی نکالتے رہے ہیں۔ اس کا زیادہ زور 1970 کے بعد کے شعر و ادب کی تفہیم و ترویج پر رہا اور اس مہم میں ڈاکٹر صادق اور ڈاکٹر عتیق اللہ ان کے معاونِ خصوصی رہے، حالانکہ ان دونوں کا تعلق 1960 اور 1970 کی درمیانی مدت میں نمایاں ہونے والے لوگوں سے ہے۔ "استعارہ" میں صلاح الدین پرویز کی تحریریں ان کے مخصوص اسلوب کی نمائندگی کرتی ہیں جس میں تخلیقیت کے ساتھ طنز و تعریض کی پُٹ بھی شامل رہتی ہے۔ ان کے رفیق کار حقانی القاسمی ہیں۔ تازہ مطبوعات پر ان کے تبصرے صرف ان کتابوں کا ہی نہیں، پوری عصری ادبی صورتِ حال کا محاکمہ کرتے نظر آتے ہیں۔ کئی سربرآوردہ قلمکاروں کا تعاون اس رسالے کو حاصل ہے۔

"آجکل" کے ادارتی عملے کے سابق رکن اور سنجیدہ قلمکار نند کشور وکرم "عالمی اردو ادب" کے نام سے ایک سالنامہ شائع کرتے ہیں۔ یہ سال بھر کی مدت میں مختلف رسالوں میں شائع شدہ نثری اور شعری ادب کے انتخاب پر مشتمل ہوتا ہے اور متعلقہ سال میں پیش آنے والے اہم ادبی واقعات کا بھی احاطہ کرتا ہے۔ نند کشور وکرم آزمودہ کار ادیب اور صحافی ہیں اور ان کا ادارتی سلیقہ ان کے مرتب کردہ سالنامے میں صاف نظر آتا ہے۔

دلّی سے ایسے رسالے بھی نکلتے رہے ہیں اور اب بھی نکل رہے ہیں جنھیں ہم مکمل ادبی نہیں تو نیم ادبی ضرور کہہ سکتے ہیں۔ یہ رسالے تحقیقی اور تنقیدی مضامین شائع نہیں کرتے لیکن معیاری افسانوی اور شعری ادب ان میں شائع ہوتا رہا ہے۔ ان رسائل نے اردو قارئین کا ایک بڑا حلقہ پیدا کیا اور ان کے ذوقِ مطالعہ کی تسکین کا سروسامان فراہم کرتے رہے۔ حافظ محمد یوسف دہلوی کا ماہانہ رسالہ "شمع" عرفِ عام میں فلمی رسالہ تھا لیکن اس کے آدھے یا آدھے سے کچھ زیادہ صفحات ادبی تخلیقات کے لیے وقف رہتے تھے اور اس کے لیے لکھنے والوں میں اردو کے اہم ترین لوگ شامل تھے۔ "بیسویں صدی" جس کے مالک و مدیر خوشتر گرامی تھے اور جو لاہور سے اس رسالے کو اپنے ساتھ دلّی لائے تھے، اس کے تمام تر صفحات افسانوی اور شعری مواد پر مشتمل ہوتے تھے۔ سال میں اس کی دو خصوصی اشاعتیں بھی سامنے آتی تھیں، ایک سالنامہ اور ایک افسانہ نمبر۔ اسے بھی تمام اہم نئے اور پرانے قلمکاروں کا تعاون حاصل رہا۔ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں وہ اپنی یہ متاع عزیز جناب ضیاء الرحمٰن نیر کے حوالے کر گئے تھے۔ نیر صاحب نے نہ صرف اس کی پرانی روایات کو برقرار رکھا ہے بلکہ اس میں کچھ اضافے بھی کیے ہیں مثلاً ہنگامی سیاسی مسائل پر مضامین اور دہلی کی ادبی سرگرمیوں کی رپورٹنگ۔ ڈاکٹر شمع افروز زیدی ان کی معاون مدیرہ ہیں۔ نیر صاحب نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز ماہنامہ "روبی" کے اجرا سے کیا تھا۔ "شمع" کی طرح یہ بھی فلمی رسالہ تھا مگر اس کا ادبی حصّہ بھی وقیع ہوتا تھا۔ بعد میں انھوں نے یہ رسالہ اپنے ایک پرانے رفیق کار جناب افسر جمشید کے حوالے کر دیا تھا، جنھوں نے اسے فلمی کی بجائے مذہبی رنگ دے دیا تھا۔ اپنے اس نئے رنگ میں یہ زیادہ نہیں چلا اور اس کی اشاعت بند ہو گئی۔

یہاں کچھ اور ماہانہ رسالوں کی طرف بھی دھیان جاتا ہے۔ "جمالستان" جس کے مالک اور مدیر نجم صدیقی تھے اور ان کے معاون مخمور عثمانی اور زاہد رضوی۔ میری پہلی نظم اسی کے 1950 کے سالنامے میں چھپی تھی۔ تب تک میں دلّی نہیں آیا تھا۔ دلّی آنے کے بعد میں نے بھی اس کے لیے کچھ مدت تک جزوقتی کام کیا۔ دیگر رسائل میں، جنھیں اس ذیل میں رکھا جاسکتا ہے۔ "شاہکار" (زاہد رضوی) "شانِ ہند" (سرور تونسوی) "آریہ ورت" (ایم سکندر) "نرالی دنیا" (اظہار اثر) "تیز گام" (شاہد پرویز اور فاروق ارگلی) "فلمی ستارے" (حاجی انیس دہلوی) "گلفام" (سلطان اختر) "مستانہ جوگی" (جے. پی. بھٹناگر) "آگہی" (طاہر فاروقی) اور "گل فشاں" (مخمور سعیدی) کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ اب ان میں سے صرف دو رسالے "مستانہ جوگی" اور "فلمی ستارے" زندہ ہیں، باقی سب مرحوم ہوئے۔ "فلمی ستارے" کے بانی مدیر حاجی انیس دہلوی نے اپنی زندگی کے آخری دنوں میں "ایوانِ ادب" کے نام سے ایک خالص ادبی رسالہ بھی نکالا تھا مگر ان کے انتقال کے بعد اس کی اشاعت موقوف ہو گئی۔ اس کے تین چار شمارے نکلے۔

یہاں دو سرکاری رسالوں کا ذکر بھی بے محل نہ ہوگا، یہ ہیں "یوجنا" اور "سینک سماچار"۔ "یوجنا" کا بنیادی مقصد اپنے قارئین کو حکومت کے ترقیاتی منصوبوں سے باخبر رکھنا ہے اور "سینک سماچار" فوجی سرگرمیوں کی اطلاعات فراہم کرتا ہے لیکن دونوں ادبی تحریریں بھی شائع کرتے رہتے ہیں۔ "یوجنا" کے موجودہ ایڈیٹر ابرار رحمانی ہیں جو نئے قلمکاروں میں اپنی ایک پہچان بنا چکے ہیں۔

دتی سے کئی ڈائجسٹ بھی نکلے اور بند ہوئے۔ کچھ اب بھی نکل رہے ہیں۔ ان میں افسانے یا قسط وار ناول شائع ہوتے ہیں جو بالعموم پاکستانی ڈائجسٹوں سے اٹھا لیے جاتے ہیں۔ ”شمع“ کے ادارے سے نکلنے والا ”شبستاں“ ضرور طبعزاد تحریریں شائع کرتا تھا۔ اس کے مرتب مشہور صحافی سلامت علی مہدی تھے۔ اردو قارئین کا حلقہ بنانے میں ان ڈائجسٹوں کا بھی حصہ ہے۔ ”ہما“ اور ”ہدیٰ“ کثیرالاشاعت ڈائجسٹ رہے ہیں۔

خواتین کے ماہانہ رسالوں میں ”خاتونِ مشرق“، ”بانو“ اور ”پاکیزہ آنچل“ کے نام نمایاں ہیں۔ ”خاتونِ مشرق“ کے بانی عبداللہ فاروقی تھے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے بڑے بیٹے توفیق فاروقی نے اسے سنبھال لیا تھا۔ اب وہ بھی اس دنیا میں نہیں لیکن رسالہ زندہ ہے اور اسی خاندان کی ملکیت میں ہے۔ ”بانو“ کی مدیرہ جناب انور علی دہلوی کی بیگم زینب انور صاحبہ تھیں مگر یہ انور صاحب کی دیکھ ریکھ ہی میں نکلتا تھا۔ پھر یہ رسالہ ”شمع“ والوں نے لے لیا تھا اور اس کا روپ رنگ یکسر بدل گیا تھا۔ بطور مدیرہ زینت کوثر صاحبہ کا نام چھپنے لگا تھا۔ بدلا ہوا رنگ روپ شاید اسے راس نہیں آیا اور اس کی اشاعت منقطع ہوگئی۔ ”پاکیزہ آنچل“ باقاعدگی سے نکل رہا ہے مگر اس کی نوعیت ڈائجسٹ کی ہے۔

ادبِ اطفال کی اہمیت ہر زبان میں تسلیم کی گئی ہے۔ بچوں کے لیے لکھنا بڑوں کے لیے لکھنے سے زیادہ مشکل کام ہے۔ اس مشکل کام کی طرف اردو کے نئے پرانے قلمکاروں کو متوجہ کرنے میں بھی ”شمع“ کے ادارے سے نکلنے والے ”کھلونا“ کا اہم کردار رہا۔ اس کی پیشانی پر ”آٹھ سے اسّی سال تک کے بچوں کے لیے“ درج ہوتا تھا اور واقعہ ہے کہ اسے چھوٹے بڑے سب شوق سے پڑھتے تھے۔ مشہور صحافی ناز انصاری کا ”پھلواری“ بھی برسوں تک باقاعدگی سے نکلا۔ ایک رسالہ ”پھول“ بھی تھا۔ اب جو رسالے نکل رہے ہیں ان میں قدیم ترین ”رہنمائے تعلیم“ ہے جو اپنی زندگی کے سو سال پورے کرنے والا ہے۔ یہ رسالہ ماسٹر جگت سنگھ نے لاہور سے جاری کیا تھا، آزادی کے بعد یہ ان کے ساتھ دلی آیا اور اب اس کے ایڈیٹر ان کے صاحبزادے ہربجن سنگھ ہیں جو خود بھی عمر کی اسّی سے زیادہ منزلیں طے کر چکے ہیں۔ تسخیر فہمی اور قمر سنبھلی ان کے معاونین ہیں۔ ”پیامِ تعلیم“ بھی پرانا رسالہ ہے جو مکتبہ جامعہ کے زیرِ اہتمام شائع ہوتا ہے۔ اس کے موجودہ مدیر شاہد علی خاں ہیں۔ ”امنگ“ دلی اردو اکادمی کے اہتمام میں شائع ہوتا ہے۔ اس کا بانی مدیر راقم الحروف رہا ہے۔ سرورق کے علاوہ اس کے اندرونی صفحات بھی رنگین چھپتے ہیں کہ رنگ برنگی چیزیں بچوں کے لیے پرکشش ہوتی ہیں۔ ”بچوں کی نرالی دنیا“ تنویر احمد اور فضلِ رزاق ارشد ترتیب دیتے ہیں، اس کے ابتدائی چند صفحات مذہبی معلومات کے لیے وقف ہیں۔

چند ہفت روزہ جرائد کا ذکر بھی شاید نامناسب نہ ہوگا۔ ان میں سے اکثر کا بنیادی سروکار اگرچہ سیاست سے رہا لیکن ان کے صفحات میں ادبی تحریریں بھی جگہ پاتی رہی ہیں۔ ”ریاست“ سردار دیوان سنگھ مفتوں نکالتے تھے۔ یہ آزادی کے پہلے سے نکل رہا تھا اور اس کی آمدنی کا وسیلہ دیسی ریاستوں کے وہ حکمراں تھے جن کی سیاسی اور اخلاقی کمزوریوں کا پردہ فاش کرنا، اس اخبار کا خاص وتیرا تھا۔ اپنی کمزوریوں کی پردہ پوشی اور کبھی کبھی اپنی حمایت میں کچھ لکھوانے کے لیے وہ سردار صاحب کی منہ بھرائی کرتے رہتے تھے۔ ریاستوں کے خاتمے کے بعد اخبار کا یہ ذریعۂ آمدنی باقی نہیں رہا لیکن مفتوں صاحب اسے نکالتے رہے۔ اس کا ایک مستقل کالم ”ناقابلِ فراموش“ کے عنوان سے تھا۔ مفتوں صاحب اپنی لمبی عمر میں، بچپن سے بڑھاپے تک، ایسے عجیب وغریب حالات و واقعات سے گزرے تھے جو ان کے لیے ناقابل فراموش تھے۔ اس کالم میں ایسے ہی واقعات کا ذکر ہوتا تھا۔ اس کالم کا ایک انتخاب انھوں نے کتابی صورت میں بھی اسی نام سے شائع کرایا تھا۔ ”ریاست“ میں ہر ہفتے کسی نامور شاعر کی نظم بھی چھپتی تھی۔

”ریاست“ کی مالی بنیادیں متزلزل ہوجانے کے بعد مفتوں صاحب نے اسے حافظ یوسف دہلوی کے حوالے کردیا۔ کچھ معاوضہ لے کر یا بلامعاوضہ، یہ میرے علم میں نہیں۔ ”شمع“ کے ادارے سے اس کی اشاعت بڑے خوش نما گیٹ اپ کے ساتھ آفسیٹ پر شروع ہوئی۔ یہ طے پایا تھا کہ اداریے شذرے مفتوں صاحب ہی لکھا کریں گے۔ کچھ شماروں تک یہ سلسلہ چلا مگر پھر مفتوں صاحب کی تحریروں میں، جو اردو صرف ونحو کے کسی قاعدے کی پابند نہیں تھیں، اصلاح کی جانے لگی۔ مفتوں صاحب کو یہ گوارا نہ ہوا۔ انھیں اپنی تحریر میں کسی طرح کی ترمیم منظور نہ تھی۔ انھوں نے اپنا اخبار واپس لے لیا۔ پھر کچھ مدت بعد ”ریاست“ بند ہوگیا۔ حکومتِ ہند کے وزیرِ تعلیم مولانا آزاد نے حکومت کی طرف سے مفتوں صاحب کا ڈھائی سو روپے ماہوار وظیفہ جاری کرادیا اور وہ دتی سے دہرہ دون منتقل ہوگئے۔ وہیں ان کا انتقال ہوا۔

مذکورہ بالا الٹ پھیر کے نتیجے میں ”شمع“ کے ادارے سے ہفت روزہ ”آئینہ“ کا اجرا ہوا اور اس کا ایڈیٹر ظ۔ انصاری کو بنایا گیا۔ ”آئینہ“ بہت ہی خوبصورت ہفت روزہ تھا، معنوی لحاظ سے بھی اور صوری اعتبار سے بھی۔ اس کے زیادہ صفحات شعروادب کے لیے وقف تھے۔ ظ۔ انصاری نامور ادیب اور آزمودہ کار صحافی تھے۔ وہ غضب کے جدت پسند تھے اور انھوں نے اپنی تمامتر صلاحیتیں ”آئینہ“ کو بنانے سنوارنے میں لگادی تھیں مگر پھر انھی کی وجہ سے اس کی اشاعت بھی موقوف ہوئی۔ انصاری صاحب کامریڈ تھے، ان کا

اندر کا کامریڈ جاگا اور انھوں نے ''شمع'' کے دفاتر میں ملازمین کی ہڑتال کرادی۔ ہڑتال کا نتیجہ کچھ مثبت نہیں نکلا۔ ''شمع'' کے پرانے ملازمین نے ہڑتال میں حصہ نہیں لیا۔ ہڑتال میں بڑھ چڑھ کر ''آئینہ'' کے عملے نے حصہ لیا جس کے بیشتر لوگ ظ.صاحب کی سفارش پر نئے نئے بھرتی کیے گئے تھے اور غالبًا ابھی مستقل نہیں ہوئے تھے۔ ''شمع'' کے مالکان نے ان سے نجات حاصل کرنے کی آسان ترکیب یہ نکالی کہ مالی گھاٹا دکھا کر ''آئینہ'' کی اشاعت بند کردی اور جو عملہ اس کے لیے رکھا گیا تھا، برطرف کر دیا گیا۔ ان میں پہلا نام خود ظ.انصاری کا تھا۔

دلّی سے نکلنے والا ایک اہم ہفت روزہ ''پیامِ مشرق'' تھا۔ اس کے مالک صاحبزادہ محمد مستحسن فاروقی تھے جو درگاہ شاہ کلیم اللہ کی سجادگی کے علاوہ ایک دواخانہ بھی چلاتے تھے جس کی دواؤں کی تشہیر کے لیے انھوں نے ''پیامِ مشرق'' کی اشاعت شروع کی تھی لیکن اس سے اشرف بھوپالی، ناز انصاری اور مہدی نظمی جیسے صحافی وابستہ رہے۔ ان کے قلم سے نکلے ہوئے سیاسی شذرے تو ''پیامِ مشرق'' کو پرکشش بناتے ہی تھے لیکن اس کے کچھ صفحے ادبی تحریروں کے لیے وقف تھے۔ میری نظم ''جنون وخرد'' جو اسی عنوان کی جوش ملیح آبادی کی نظم کے ردِعمل میں کہی گئی تھی، پہلی بار یہیں شائع ہوئی اور مجھ سے جوش صاحب کی مستقل ناراضی کا سبب بنی۔

ایک ہفت روزہ اخبار شاہد پرویز نے ''سات دن'' کے نام سے نکالا تھا جو شروع سے آخر تک ادبی مواد پر مشتمل ہوتا تھا۔ خبریں بھی ادبی دنیا کے شب و روز سے تعلق رکھتی تھیں، اس کے چند ہی شمارے نکلے۔ اسی طرح کا ایک ہفت روزہ ''دلی والا'' کے نام سے صابردت نے نکالا تھا۔ صابردت جب تک دلّی میں رہے، یہ باقاعدگی سے تو نہیں لیکن کبھی کبھار نکلتا رہا۔ دلی سے ممبئی منتقل ہوجانے کے بعد انھوں نے ''فن اور شخصیت'' نکالا اور وہاں ان کے جوہر کھل کر سامنے آئے۔ دلّی سے ایک ادبی ہفت روزہ ''پاکیزہ'' کے نام سے بھی نکلا تھا۔ اس کا اجرا کچھ نوجوان قلمکاروں کی مشترکہ کوشش کا نتیجہ تھا۔

میر مشتاق احمد دلّی کی سرکردہ سیاسی اور سماجی شخصیت تھے۔ طالب علمی کے زمانے سے آزادی کی لڑائی میں شریک ہوگئے تھے۔ پنڈت نہرو اور جے پرکاش نرائن کے سوشلزم کے تصورات سے متاثر تھے۔ جے پرکاش نرائن نے پرجا سوشلسٹ پارٹی قائم کی تو میر صاحب اس کے اہم لیڈروں میں تھے، اسی پارٹی کے ٹکٹ پر انھوں نے دلّی کے چاندنی چوک کے پارلیمانی حلقے سے پارلیمنٹ کا الیکشن بھی لڑا لیکن کانگریس کے امیدوار سے ہار گئے۔ پھر انھوں نے کانگریس میں شمولیت اختیار کرلی اور دلی کے چیف ایگزیکیٹو کونسلر بنے جو اُن دنوں چیف منسٹر کے ہم معنی تھا۔ وہ ''ایشیا'' کے نام سے ایک ہفت روزہ نکالتے تھے جو اُن کے سیاسی خیالات کی ترویج کا ایک وسیلہ تھا لیکن انھیں شعروادب سے بھی گہرا لگاؤ تھا اس لیے ''ایشیا'' میں ادبی مضامین نثر و نظم بھی چھپتے تھے۔ اس کے ادبی حصے کی ترتیب و تدوین کی ذمے داری میر صاحب نے مجھے سونپ دی تھی اور میرا نام بھی ادارے میں شامل کرلیا تھا۔

حافظ علی بہادر خاں پرانے کانگریسی تھے اور صحافت کا تجربہ رکھتے تھے۔ انھوں نے کانگریس کے ایما پر ہی ممبئی سے دلّی آکر ایک ہفت روزہ نکالا تھا۔ اس میں بھی علمی اور ادبی نگارشات شائع ہوتی تھیں۔ ادب کے حوالے سے اس کی کچھ خصوصی اشاعتیں بھی نکلیں جو ضخیم تھیں اور ان کے مہمان مدیر علی عباس عباسی تھے۔ ایک خصوصی اشاعت میں ان دنوں دلّی میں مقیم سبھی معروف شاعروں کا تذکرہ تھا اور ان کے کلام پر مختصر تبصرہ بھی جس میں کہیں کہیں چٹکیاں بھی لی گئی تھیں۔

یہ ہفت روزہ اخبارات اب ماضی کا حصہ بن چکے ہیں۔ اب جن ہفت روزہ اخبارات کو ادب سے دلچسپی ہے ان میں ''نئی دنیا''، ''اخبارِ نو''، ''خبردار جدید'' اور ''عالمی سہارا'' کے نام نمایاں ہیں۔ ''نئی دنیا'' شاہد صدیقی کی ادارت میں نکل رہا ہے۔ ''اخبارِ نو'' کے مالک اور مدیر م.افضل ہیں۔ ان دونوں حضرات کے نام موجودہ دور کی سرگرم سیاست میں نمایاں ہیں۔ ''خبردار جدید'' کے مالک و مدیر معصوم مرادآبادی ہیں، سیاست سے انھیں بھی شغف ہے مگر ابھی عملی سیاست میں نہیں آئے ہیں۔ ''عالمی سہارا'' کے ایڈیٹر عزیز برنی ہیں اور اس ادارے میں کئی تجربہ کار صحافی شامل ہیں۔ اس میں ہر ہفتے چند صفحات شعری اور افسانوی ادب نیز ادبی کتابوں پر تبصرے کے لیے وقف رہتے ہیں۔ بعض اہم قلمکاروں کے انٹرویو بھی اس نے شائع کیے ہیں— انجمن ترقی اردو (ہند) کا ہفت روزہ ''ہماری زبان'' تو ہے ہی اردو کے کاز کو آگے بڑھانے کے لیے۔

یہ دلّی کے ان جریدوں کا سرسری ذکر ہے جن تک میری رسائی ہوسکی۔ ادھر کچھ نئے جریدے بھی نکلے ہیں جیسے ''صبحِ فردا'' جس کے ایڈیٹر رفیق الزماں اور نگراں مناظر عاشق ہرگانوی ہیں۔ مجلسِ ادارت میں فرحت احساس، اشہر ہاشمی اور اسما سلیم کے نام ہیں۔ ایک مجلس مشاورت بھی ہے۔ ضخامت کم ہے لیکن اس میں چھپنے والی اکثر تحریریں خیال انگیز ہوتی ہیں— کئی رسائل کی خدمات تفصیلی ذکر کی متقاضی ہیں لیکن اس مختصر مضمون میں تفصیلات کی گنجائش نہیں تھی۔ ان میں کچھ ایسے بھی ہیں جن کے اشاریے تیار ہونے چاہئیں۔ دلی میں تین بڑی یونی ورسٹیاں ہیں، یہ کام ان کے اردو شعبے سرانجام دے سکتے ہیں— مضمون میں اگر کچھ رسائل کا ذکر چھوٹ گیا ہو تو اسے میری بے خبری یا سہو پر محمول کیا جائے، عمداً میں نے ایسا نہیں کیا ہے۔

□□□

رام پرکاش کپور

# اردو ــــ مشترکہ قومی وراثت

مئی کا اردو دنیا کا شمارہ ملنے پر پڑھ نہیں سکا تھا۔ بنا پڑھے ہی کتابوں میں رکھا رہ گیا تھا۔ جب جون کے شمارے کی ورق گردانی کرنے لگا تو جناب جی.ڈی. چندن کے مراسلے پر نظر پڑی۔ دو مراسلے پڑھے، شیبا فہمی صاحبہ نے جناب راجیندر یادو کے مضمون کا جواب تو لکھا ہے لیکن کئی باتوں کا جواب نہیں دیا گیا۔ مثلاً جناب راجیندر یادو نے لکھا ہے کہ" راہل، یشپال، امرت رائے، امرت لال ناگر فرقہ پرست نہیں تھے۔۔۔۔'' ہوسکتا ہے کہ وہ فرقہ پرست (اینٹی مسلم) نہ ہوں لیکن یہ طے ہے کہ وہ اینٹی اردو تھے۔ جناب امرت لال نے اپنی کتاب میں اردو کو ایک علاحدہ زبان ماننے سے ہی انکار کیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اردو کوئی علاحدہ زبان نہیں ہندی کی ایک شیلی (Dialect) ہے۔

جناب راجندر یادو نے اردو رسم خط کے کچھ نقائص بھی گنوائے ہیں۔ ایسے نقائص ہر زبان کے رسمِ خط میں ہیں۔ انگریزی رسمِ خط میں تو سب سے زیادہ ہیں۔ جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنے ایک مضمون میں دیوناگری رسمِ خط کے متعدد نقائص گنوائے ہیں۔ جو اردو رسمِ خط کے نقائص سے کہیں زیادہ ہیں۔

میری مادری زبان پنجابی ہے بقول آنجہانی پروفیسر کنہیالال کپور" اردو پنجابیوں کی مادری زبان نہیں ہے، محبوبہ ضرور ہے، جس سے انھوں نے ڈٹ کر محبت کی ہے۔ جنون کی حد تک عشق کیا ہے۔'' میں بھی اردو زبان سے بہت پیار کرتا ہوں اور اسے اپنی مشترکہ گنگا جمنی ثقافت اور تہذیب وتمدن کی وارث سمجھتا ہوں۔ اردو جسے ہر فرقے کے لوگ بولتے اور سمجھتے تھے اور آج بھی بولتے اور سمجھتے ہیں۔ جو شاہی محلوں سے لے کر گلی کوچوں اور بازاروں تک بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ اسے آج مذہب کے تنگ دائرے میں قید کرکے ایک خاص فرقے کی زبان قرار دیا جانے لگا ہے اور کچھ جانے مانے ادیبوں اور دانشوروں نے بھی یہ کہنا شروع کردیا ہے کہ" آج کے ماحول اور حالات کے مدِ نظر اردو کو بلا تامل مسلمانوں کی اکثریت کی زبان مان لینا چاہیے۔'' مجھے ان صاحبان کی نیک نیتی اور خلوص پر کوئی شبہ نہیں ہے۔ وہ خلوص اور دیانت داری سے ایسا محسوس کرتے ہوں گے کہ آج ہندستان میں اردو صرف مسلمانوں کی زبان بن کر رہ گئی ہے۔ لیکن مجھے ان سے اتفاق نہیں ہے۔ آج کے ماحول کی مشکلات اور غلط فہمیوں کے باوجود میں یہ نہیں مان سکتا کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے:

تجھ سے ملیں اے حسینۂ اردو
لوگ کہتے ہیں پیار کرتا ہوں
پیار ہی تجھ سے میں نہیں کرتا
جان تجھ پر نثار کرتا ہوں

کالی داس گپتا رضا

بزمِ ادبِ ہند کے ہر گل میں ہے خوشبو
مُلّا گلِ اردو کی مہک اور ہی کچھ ہے

آنند نارائن مُلّا

اردو داں ہونا شائستگی کا دوسرا نام ہے۔ آنجہانی رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری اپنے طلبہ سے کہا کرتے تھے کہ" اردو اس لیے بھی پڑھو کہ افسر بننے کے بعد افسر دکھائی دو۔'' اس جملے کی معنویت کئی پُرمغز مقالوں کا درجہ رکھتی ہے۔ اس جملے سے اس بات کی وضاحت بھی ہوتی ہے کہ اردو صرف زبان ہی نہیں تہذیب بھی ہے۔ ہندستان کی مخلوط گنگا جمنی تہذیب کی روایات کی امین یہ زبان شیرینی کی کان اور مادرِ وطن کی عظمت کا نشان ہے۔ جو ہندستان کی مقدس سرزمین پر یہیں کے مختلف النسل اور مختلف اللسان باشندوں کی ہم نشینی کی کوکھ سے جنمی، یہاں کے کھیتوں کھلیانوں، گھروں اور بازاروں میں پلی بڑھی۔ یہاں کے سبزہ زاروں، ساحلوں اور کوہساروں کی گود میں کھیلی۔ سمندر کی لہروں، ریگستان کی چمک دمک، اودھ کی تراش خراش، دکن کی صنعت گری اور پنجاب کی توانائی سے مالا مال ہوئی۔ یہ ہمارا مشترکہ قومی ورثہ ہے۔ اس نے ہمیں منفرد پہچان عطا کی ہے۔ یہ ایک ایسی زبان ہے جس نے ہندستان کی اجتماعی تواریخ کے دورِ جدید میں غیر معمولی رول ادا کیا ہے۔ اس نے ہمیں ــ'' سارے جہاں سے اچھا.....''، '' میرا وطن وہی ہے'' جیسے قومی ترانے اور '' انقلاب زندہ باد'' اور'' جھنڈا اونچا رہے ہمارا'' جیسے جوشیلے نعرے دیے۔ در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں، خوش رہو اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں۔ گنگناتے ہوئے سیکڑوں نوجوان انڈمان نکوبار (کالا پانی) گئے اور ــ

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

کہتے ہوئے سیکڑوں نوجوان ہنستے ہنستے پھانسی پر جھول گئے۔ جوش ملیح

آبادی کی نظم "ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے" گاتا ہوا طلبہ کا ایک جلوس 1942 میں الٰہ آباد میں انگریزی حکومت کی لاٹھی اور گولی کا شکار ہوا۔ ٹیکا رام سخن کی غزل ۔

شہیدوں کی چتاؤں پر لگیں گے ہر برس میلے
وطن پہ مرنے والوں کا یہی باقی نشاں ہوگا

آج بھی آزادی کے شہیدوں کی یاد میں گائی جاتی ہے۔ ہریانہ کے مجاہد آزادی آنجہانی ہرچند آہوجہ نے ہجرت کر کے اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا: "یہ ایک زندہ حقیقت ہے کہ اردو نے ہندستان کی تحریکِ آزادی میں بھرپور مجاہدانہ فرض انجام دیا ہے یہ زبان ہم مجاہدوں کا اوڑھنا بچھونا ہی نہیں بلکہ آزادی کے جہاد میں ہماری رہنما رہی ہے۔ جس کی وسعتیں ہمالیہ کی بلندی سے گنگا جمنا کی لہروں تک دکھائی دیتی ہیں۔۔۔۔" جنگِ آزادی میں اردو کا حصہ ایک موضوع ہے اس لیے اس بارے میں سر دست کچھ لکھنا نہیں چاہتا۔ یہ سب بیان کرنے سے میرا مقصد ہے کہ ایسی سنہری روایات کی حامل زبان کو کوئی محبِ وطن کیسے نظرانداز کرسکتا ہے اور اُسے قومی زبانوں میں شمار کرنے اور ماننے سے انکار کرسکتا ہے۔ تحریکِ آزادی میں اردو کا رول باقی سب ملکی زبانوں سے زیادہ اہم ہے۔ زبان خود تحریکِ آزادی تھی۔

جس طرح ہندستان نے مختلف مذاہب اور مختلف نسلوں کے لوگوں کو اپنی گود میں جگہ دے کر اپنی عالی ظرفی، کشادہ دلی اور رواداری کا ثبوت دیا، اسی طرح ہندستانی زبان اردو نے مختلف مذاہب اور مختلف زبانوں کے خیالات و الفاظ کو اپنے دامن میں سمیٹ کر اپنی وسیع المشربی اور وسیع القلبی کا ثبوت دیا ہے۔ بقول فراق گورکھپوری:

سرزمینِ ہند پر اقوامِ عالم کے فراق
قافلے بستے گئے ہندستاں بنتا گیا

آنجہانی پروفیسر کنہیا لال کپور نے اپنی کتاب "گردِ کارواں" کے پیش لفظ میں لکھا تھا:

"......یادش بخیر ایک وہ زمانہ تھا کہ اردو کو سرآنکھوں پر بٹھایا جاتا تھا۔ پھر نہ جانے کس کی نظر کھا گئی کہ اس سے دامن بچا کر نکل جانے میں ہی خیریت سمجھی جانے لگی۔ ان دنوں اربابِ وطن اس سے یوں بدکتے ہیں جیسے یہ کوئی خطرناک چیز ہو۔ ہندستان میں اردو کی یہ حالت اس لیے ہوئی کہ اردو کے دشمنوں اور نادان دوستوں نے اسے مسلمانوں کی زبان بنا دیا۔ یہ خوبصورت زبان ہندستانی اور اسلامی تہذیب کے امتزاج سے وجود میں آئی۔ یہ مشترکہ تہذیب کی نشانی تھی۔ اس کی سرپرستی ہر مذہب کے لوگوں نے کی۔ ہمارے بچپن میں لوگ بھگوت گیتا اور بائبل اردو زبان میں پڑھتے تھے۔ یہ میٹھی زبان تو پیار محبت اور اتحاد کی نشانی تھی۔ اس کی سرپرستی ہر مذہب کے لوگوں نے کی۔ مگر آزادی کے بعد یہ فرقہ پرستوں کی بھینٹ چڑھ گئی۔۔۔۔"

دراصل ہوا یوں کہ شمالی ہند کے مسلمانوں کے ساتھ اردو کے سلسلے میں بھی یہ رائے قائم کرلی گئی کہ یہ زبان تقسیم کی ذمّے دار ہے۔ یہ گمراہ کن پروپیگنڈا چند شرپسند اور شریر ذہنوں کی شعوری کوشش کا نتیجہ تھا۔ بھولے بھالے عوام ان باتوں میں آگئے۔ پھر وقت گزرنے کے ساتھ جب دُھند چھٹی تو ہندستان کا سارا منظرنامہ ہی بدل چکا تھا۔ اردو کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ چکا تھا۔ ایک پوری نسل اردو رسمِ خط سے بے بہرہ رہ گئی تھی۔

ہندستان میں اردو دشمنوں کی سازش کو سرحد پار سے بھی مدد اور طاقت ملی۔ دراصل ہوا یوں کہ مولانا سید سلیمان ندوی اور بابائے اردو مولوی عبدالحق نے پاکستان جا کر یہ کہنا شروع کردیا کہ اردو نے پاکستان بنوایا ہے۔ اس لیے اردو کو پاکستان کی قومی اور رابطے کی زبان ہونا چاہیے۔ مولوی عبدالحق نے 15/فروری 1961 کو کراچی میں غالب کی برسی کے موقعے پر اپنی تقریر میں کہا تھا: "...... پاکستان نہ جناح نے بنایا نہ اقبال نے بلکہ پاکستان اردو نے بنایا۔ ہندوؤں مسلمانوں میں اختلاف کی اصلی وجہ اردو ہی تھی۔ دو قومی نظریہ اور ایسے اختلافات صرف اردو کی وجہ سے تھے......" اس سے پاکستان میں اردو کا کچھ بھلا ہوا ہو یا نہ ہوا ہو لیکن ہندستان میں یقیناً اس کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا۔ یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ ہندستان میں اردو دشمن عناصر، جو دلائل اردو کو دیش نکالا دینے کے لیے دیتے رہے۔ وہی دلائل پاکستان کے "محبانِ اردو" اردو کو بڑھاوا دینے کے حق میں دیتے ہیں۔

1938 میں پٹنہ میں انڈین نیشنل کانگریس اور انجمن ترقی اردو میں ایک معاہدہ ہوا تھا جس کی رو سے "ہندستانی" اردو اور دیوناگری دونوں اسکرپٹ میں آزاد ہندستان کی قومی زبان مان لی گئی تھی۔ اس معاہدے پر انجمن کی طرف سے مولوی عبدالحق اور گاندھی جی نے اور کانگریس کی طرف سے ڈاکٹر راجیندر پرساد نے دستخط کیے تھے۔ گاندھی جی کی ایما پر ہی کانگریس نے یہ معاہدہ کیا تھا۔ لیکن تقسیم کے بعد کے حالات میں اور گاندھی جی کی شہادت کے بعد کانگریس اپنے وعدے پر قائم نہ رہ سکی اور 1950 میں آئین ساز اسمبلی میں اتفاقِ رائے سے ہندی دیوناگری اسکرپٹ میں ہندستان کی قومی زبان مان لی گئی۔ اردو ملک کی دوسری علاقائی زبانوں کے ساتھ آٹھویں شیڈول میں شامل کرلی گئی۔ جب پنڈت جواہر لال نہرو آٹھویں شیڈول میں شامل زبانوں کی فہرست آئین ساز اسمبلی میں پیش کر رہے تھے تو ہندی کے ایک کٹر حامی سیٹھ گووند داس نے چلّا کر پوچھا۔ "بھلا اردو کس کی مادری زبان ہوسکتی ہے۔" تو پنڈت نہرو نے اسی طرح اونچی آواز میں چلّا کر جواب دیا "اردو

میری ماں اور دادی کی زبان ہے جسے میں بچپن سے بولتا آرہا ہوں۔'' چنانچہ اردو کی آٹھویں شیڈول میں شمولیت منظور کرلی گئی۔ اردو کے لیے آٹھویں شیڈول میں شمولیت کے علاوہ کچھ دوسری گنجائشیں بھی رکھی گئی تھیں۔ مگر افسوس کہ دستور کی یہ واضح دفعات بھی اردو کو ملکی اور تعلیمی نظام میں اس کا جائز حق نہ دلا سکیں۔

اتنی لمبی تمہید کی ضرورت اس لیے پڑی کہ میں تفصیل سے پورا پسِ منظر واضح کردینا چاہتا تھا۔ ملک کے کئی محبانِ اردو کا اب یہ خیال ہے کہ موجودہ حالات کے مدِ نظر مسلمانوں کو اردو زبان کو اپنی زبان تسلیم کرلینا چاہیے۔ اردو کو مسلمانوں کی زبان بنانے کی کوششیں پہلے بھی ہوئی تھیں۔ پہلی کوشش اپنی سامراجی پالیسی کے تحت انگریزوں نے کی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ ہندوؤں کی زبان الگ ہو اور وہ ہندی کہلائے۔ چنانچہ انھوں نے ''عود ہندی'' والے مرزا غالب کی زبان کا نام چھین کر ایک نئی زبان کو دے دیا اور ہماری زبان کا نام اردو ہوگیا۔ لیکن انگریزوں کی اس کوشش کے باوجود اردو مشترکہ زبان ہی رہی۔ جس کا ثبوت وہ سیکڑوں ہزاروں غیر مسلم اردو کے شاعر، ادیب، نقاد اور دانشور ہیں جنھوں نے اردو کو فروغ دیا اور خود بھی اس زبان کے وسیلے سے نام کمایا۔

مشہور مؤرخ ڈاکٹر تاراچند نے لکھا ہے کہ ''......مسلمانوں کی آمد کے وقت ہندوؤں کی زبان کیا تھی؟ اس اردو کی ابتدائی شکل جس کا نام ہندی/ہندوی تھا۔ اس طرح یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اردو کے آغاز و ارتقا کا سہرا صحیح معنوں میں ہندوؤں کے سر ہے۔ وہی اس کی پیدائش کے حقیقی ذمے دار ہیں۔ مسلمانوں کو اردو کی پیدائش کا ذمے دار قرار دینا حقائق کو جھٹلانا ہے۔ ہاں اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مسلمانوں نے اردو کے نکھارنے، چمکانے، سجانے، سنوارنے نیز اسے ترقی یافتہ بنانے اور ادبی مرتبے تک پہنچانے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے......''

ہندستان کی تواریخ گواہ ہے کہ اردو زبان اور اس کی پروردہ تہذیب و ثقافت نے ہندستان کی سالمیت اور یک جہتی کو اپنا شعار بنایا ہے۔ آج اردو اور اس کے عوامی کردار کو مثبت انداز سے سیاسی و سماجی پس منظر میں پیش کرنے کی ضرورت ہے اور اس کو صرف مسلمانوں کی زبان مان لینا اس کوشش میں رکاوٹ ہی ڈالے گا۔ اردو پر اپنی اجارہ داری جتانے کے بجائے مسلمانوں کو اس کے ہمہ گیر رول کو پیش کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور اس کے بارے میں جان بوجھ کر پھیلائی گئی غلط فہمیوں کو دور کرنا چاہیے اسے صرف مسلمانوں کی زبان مان لینا فرقہ پرست عناصر سے شکست قبول کرنے کے مترادف ہوگا۔

دوسری کوشش اس وقت ہوئی جب 1941 کی مردم شماری کے وقت مسلم لیگ نے متعدد بیانوں، پوسٹروں اور اشتہاروں کے ذریعے ہندستان کے مسلمانوں سے اپیل کی تھی کہ وہ مردم شماری کے وقت اس طرح کے اندراج کرائیں۔ قوم— مسلمان، مذہب— اسلام، مادری زبان— اردو، حالانکہ یہ سب کو معلوم ہے کہ صرف یوپی، بہار، دہلی و گردونواح، ریاست بھوپال، ریاست حیدرآباد کے کچھ حصوں، مرکزی ہندستان کے کچھ ضلعوں اور راجستھان کی کچھ ریاستوں کے مسلمانوں کی ہی مادری زبان اردو تھی اور ان سب علاقوں کے غیر مسلموں کی زبان بھی اردو ہی تھی۔ دوسری طرف پنجاب، سندھ، صوبہ سرحد، بلوچستان، کشمیر، بنگال، آسام، اُڑیسہ، گجرات، مہاراشٹر اور ریاست حیدرآباد کے کچھ حصوں کو چھوڑ کر باقی سارے جنوبی ہندستان کے مسلمانوں کی اکثریت کی مادری زبان اردو نہیں تھی۔ بلکہ علاقائی زبانیں تھیں۔ لیکن سیاسی مقاصد کی تکمیل کرنے کے لیے پروپیگنڈہ یہ کیا گیا کہ تمام مسلمانوں کے لیے اردو مادری زبان لکھوانا ضروری ہے۔ اس پروپیگنڈے اور اپیل کو انگریزی حکومت کی بھی حمایت حاصل تھی۔ اس اپیل نے غیر مسلم فرقہ پرست عناصر کو یہ موقع فراہم کیا کہ وہ اردو پر صرف مسلمانوں کی زبان ہونے کا ٹھپہ لگادیں۔ آزادی سے پہلے اس مہم کو کوئی خاص کامیابی نہیں ملی، لیکن ملک کی تقسیم ہونے پر پورا ماحول ہی بدل گیا۔ اردو کے خلاف مہم کو مزید تقویت اس وقت ملی جب اردو کو پاکستان کی سرکاری زبان بنا دیا گیا۔ لیکن جیسا کہ سب جانتے ہیں مشرقی پاکستان کے مسلمانوں نے اس فیصلے کو قبول نہیں کیا۔ بنگلہ دیش کے وجود میں آنے کی اور بھی وجوہات تھیں۔ لیکن نہایت اہم وجہ بنگالی مسلمانوں کی اردو سے بیزاری تھی۔ خود مغربی پاکستان میں بھی وہ مسلمان جن کی زبانیں سندھی، بلوچی یا پشتو ہیں، وہ اردو سے زیادہ مانوس نہیں ہیں۔ اور اکثر اردو کی بالادستی کے خلاف آواز بھی اٹھاتے ہیں۔ اور اب تو پنجابی مادری زبان والوں نے بھی اردو کی بالادستی کے خلاف آواز اٹھانا شروع کردیا ہے۔ اردو کو بھلے ہی پاکستان کی سرکاری زبان بنا دیا گیا ہے لیکن کراچی اور حیدرآباد سندھ کی مہاجر بستیوں کو چھوڑ کر پاکستان کے کسی حصے کے لوگوں کی مادری زبان اردو نہیں ہے۔ دوسری طرف ہندستان کے بہت بڑے حصے کے لوگوں کی مادری زبان اردو ہے۔

ماہنامہ ''انشا'' کلکتہ کے مدیر جناب ف.س. اعجاز نے اپنے ایک اداریے میں ہندستان میں اردو کو درپیش مسائل کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اب اردو کو بلا تامل مسلمانوں کی اکثریت کی زبان مان لینا چاہیے۔ اس تجویز کی مخالفت میں میں نے ایک مضمون لکھا تھا جو ''انشا'' کے اگلے

شمارے میں شائع ہوا تھا۔ اُس مضمون کو اپنی تمہید کے ساتھ کلکتہ کے ہفتہ وار "اجالا" نے بھی 14/جون 1998 کو شائع کر دیا تھا۔ عنوان تھا۔ "کیا اردو اب ہندستان میں صرف مسلمانوں کی زبان ہے" اس مضمون سے کچھ اقتباس پیش کر رہا ہوں۔

**(ہفتہ وار "اُجالا" کلکتہ 14/جون 1998)**

"اردو کے مشترکہ قومی زبان اور ہماری گنگا جمنی مشترکہ تہذیب کی وارث ہونے کو آپ بھی تسلیم کرتے ہیں۔ اس لیے اس بارے میں اس وقت کوئی دلیل دینے کی ضرورت نہیں ہے میں آپ کی اس بات پر کہ "موجودہ حقیقتوں کو تسلیم کرتے ہوئے اردو کو مسلمانوں کی اکثریت کی زبان مان لینے میں کسی کو تامل نہیں ہونا چاہیے۔" بحث کرنا چاہتا ہوں۔ آپ پہلے دانشور نہیں ہیں جو موجودہ حقیقتوں کو تسلیم کرتے ہوئے اردو کو مسلمانوں کی زبان مان لینے کی وکالت کر رہے ہیں۔ اردو کے مشہور اور معتبر ادیب جناب شمس الرحمان فاروقی نے بھی 3 اور 10 ستمبر 1994 کے اردو بلٹز میں شائع شدہ انٹرویو میں یہی کہا تھا کہ "اردو اب صرف مسلمانوں کی زبان ہے۔ یہ کبھی ہندوؤں سکھوں کی بھی زبان تھی مگر اب اردو کا منظر نامہ بدل چکا ہے۔" شمس الرحمان فاروقی صاحب کم از کم یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ اردو کبھی ہندوؤں سکھوں کی زبان بھی تھی مگر جناب عظیم اختر نے تو دہلی اردو اکادمی کے رسالے "ایوان اردو" کے نومبر 1991 کے شمارے میں چھپے اپنے مکتوب میں یہاں تک لکھ دیا تھا۔ "...... یہ بات تلخ ہے۔ ممکن ہے بہت سے دوستوں کو ناگوار گزرے مگر سچائیاں قلم بند کرتے رہنا چاہیے۔ اس لیے مجھے یہ عرض کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی کہ اردو کبھی بھی ہندستانی سماج کے مختلف طبقوں کی مشترکہ زبان نہیں رہی ہے۔ کوئی کچھ کہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ اردو کو تقسیم وطن سے قبل ہندستانی سماج کے ایک مخصوص طبقے نے اپنے آباواجداد کی میراث سمجھ کر اور قرآن و حدیث کی تفسیر کی زبان کے طور پر گلے لگایا۔ لیکن اس سماج کے دوسرے طبقے کے افراد نے کاروباری معاشی اور اسی قسم کی دوسری ضرورتوں کے دباؤ کے تحت اردو کو اپنایا۔ لیکن فاصلہ قائم رکھا۔...... تقسیم وطن کے بعد یہ ضرورتیں اور ترجیحات یکسر بدل گئیں جس کے نتیجے میں تمام کا تمام منظرنامہ ہی بدل گیا۔ اگر یہ زبان ہندستانی سماج کے تمام طبقوں کی مشترکہ زبان ہے تو صرف ایک مخصوص طبقے کی آبادی والے علاقوں میں ہی اردو میڈیم اسکولوں کے کھولنے کا کیا جواز پیش کیا جاسکتا ہے....." ایوان اردو کے مدیر نے اُسی شمارے میں جناب عظیم اختر کے جواب میں لکھا تھا" ...... یہ مفروضہ بھی صحیح نہیں کہ اردو صرف قرآن و حدیث کی ہی تفسیری زبان ہے۔ اردو مدتوں تک بول چال کی زبان رہی۔ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بہت بعد میں شروع ہوا تو صرف قرآن و حدیث کے تراجم اور تفسیریں ہی سامنے نہیں آئیں، دوسرے مذاہب کا لٹریچر بھی وجود میں آیا۔ پچھلے دنوں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے ایک دو روزہ سمینار مہرشی شوبرت لال برمن پر منعقد کیا تھا جنھوں نے سو سے زیادہ کتابیں ہندو دھرم کی ترویج و تشریح پر لکھیں اور یہ سب صرف اردو میں ہی ہیں۔ یہ کام انھوں نے اپنی بیوی کی فرمائش پر ہندو خواتین کی تعلیم و تربیت کے لیے شروع کیا تھا...... اس خیال سے بھی اتفاق نہیں کیا جاسکتا کہ غیر مسلموں نے محض معاشی ضرورتوں کے تحت اردو کو اختیار کیا جو زبان صرف معاشی یا کاروباری مقصد سے سیکھی جائے اس میں تخلیقی سرگرمیوں کا تصور محال ہے اور اس حقیقت سے کون واقف نہیں کہ اردو زبان میں غیر مسلم شاعروں ادیبوں نے اعلا تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کیا۔ اس سوال کا جواب کہ اردو میڈیم اسکول بالخصوص ان علاقوں میں ہی کیوں کھولے جاتے ہیں۔ جہاں مسلم آبادی زیادہ ہے، ہماری کوتاہ اندیشی کی خصلت ہے۔ اردو پڑھنے کے خواہش مند ہر فرقے میں موجود ہیں۔ اس کا اندازہ دہلی اردو اکادمی کی طرف سے چلائے جانے والے کوچنگ مراکز کے طلبہ سے مل کر کیا جاسکتا ہے جن میں ہر سال لگ بھگ نوے فی صد تعداد غیر مسلموں کی رہتی ہے....." آزادی سے پہلے مسلمانوں کی مذہبی کتابیں اردو میں اتنی تعداد میں نہیں چھپتی تھیں جتنی کہ ہندوؤں کی مذہبی کتابیں خاص طور سے بھگوت گیتا، رامائن اور مہابھارت اور آج بھی اس نسل کے لوگوں کے لیے چھپتی ہیں جن کے اشتہار رسائل میں اب بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔

سروس سے سبکدوش ہونے کے بعد میں نے فیصلہ کیا تھا کہ میں گھر میں بغیر فیس لیے اردو پڑھاؤں گا۔ اس بارے میں میں نے اپنے تمام دوستوں، پڑوسیوں اور واقف کاروں کو بتایا تھا اور ان سے استدعا کی تھی کہ اس بات کی زیادہ سے زیادہ پبلسٹی کریں۔ میں نے مقامی ہندی اخباروں میں اشتہار بھی دیے تھے۔ صرف ایک لڑکی میرے پاس پڑھنے آئی اور وہ ہندو تھی۔ اس بھلائی ذرگ کے علاقے میں جہاں میں ان دنوں مقیم تھا مسلمانوں کی کافی آبادی ہے، بہت سے مسلمان یوپی، بہار، راجستھان، ہریانہ، دہلی وغیرہ سے نوکری یا بزنس کے سلسلے میں وہاں آکر بس گئے ہیں لیکن ان کے بچے سب یہی کہتے ہیں کہ اردو پڑھنے سے کیا فائدہ ہوگا۔ نوکری دلانے یا مستقبل بنانے میں تو یہ مدد نہیں کرسکتی۔ ان کو اپنی ادبی اور ثقافتی وراثت کی کوئی فکر نہیں ہے اور سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اچھے بھلے مہذب اور پڑھے لکھے لوگ یہ کہتے ہوئے کوئی جھجک نہیں محسوس کرتے۔ "ہمارے بچے اردو نہیں جانتے، کوئی خط وغیرہ آتا ہے تو ہمارے لیے رکھ چھوڑتے ہیں۔ وہ تو اب گھر میں بھی انگریزی ہی بولتے ہیں۔" ایسا کہتے ہوئے وہ ایک قسم کی خوشی اور فخر محسوس کرتے ہیں۔

کیا اردو کو مسلمانوں کی زبان مان لینے سے یہ رویّہ بدل جائے گا؟

جناب حسن چشتی سکریٹری بزمِ ادب، شکاگو (امریکہ) نے کچھ سال پہلے ملک کے ادبی رسالوں اور اخباروں میں ایک مکتوب شائع کرایا تھا جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ بزمِ ادب، شکاگو کے ایک جلسے میں جناب ہاشم علی اختر سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور عثمانیہ یونیورسٹی نے اپنے خطبۂ صدارت میں کہا کہ: ''موجودہ حالات میں اگر اردو کو زندہ رکھنا ہے تو ہم کو ہندستان میں اردو کی بقا کے لیے ہندی/دیوناگری بطور زائد رسمِ خط اور مغرب میں اس کی ترویج و ترقی کے لیے رومن رسمِ خط میں لکھنا ہوگا۔'' میں نے اس موقف کی مخالفت میں ایک مکتوب جناب حسن چشتی کو بھیجا تھا جو انھوں نے امریکہ کے اخبار ''پاکستان لنک'' کے اردو صفحات میں شائع کرایا تھا۔ میرے مکتوب کے جواب میں جناب ہاشم علی اختر نے لکھا تھا۔'' .........آزادی کے بعد پہلی، دوسری اور تیسری نسل کے لوگوں میں، حکومت کی اردو دشمن پالیسی کی وجہ سے اردو رسمِ خط جاننے والے بہت کم رہ گئے ہیں۔ میرے بچوں رشتے داروں اور دوستوں میں کوئی ایک ہزار لوگوں میں سے چالیس سے کم عمر والے اردو رسمِ خط پڑھ نہیں سکتے۔ بچے ماں باپ کو انگریزی میں خط لکھتے ہیں۔ اگر کوئی شعر یا اردو لفظ لکھنا ہوتا ہے تو دیوناگری میں لکھ دیتے ہیں۔ مسلم یونیورسٹی کے ستر فی صد طلبہ اردو رسمِ خط سے واقف نہیں ہیں۔ طلبہ کی یونین کے جلسے میں معتمدِ یونین نے بڑی فصیح و بلیغ اردو میں تقریر پڑھی جب میں نے مُڑ کر دیکھا تو دیوناگری میں لکھی تھی۔'' آگے چل کر انھوں نے یہ بھی لکھا تھا:

'' ......... 1981 کی مردم شماری کے اعداد کے مطابق تین کروڑ لوگوں نے اردو کو مادری زبان بتایا ہے۔ یعنی اس طرح ہندستان کے پندرہ کروڑ مسلمانوں میں سے تین کروڑ ہی اسے اپنی زبان مانتے ہیں۔ اگر اردو کو مسلمانوں کی زبان مان لیا جائے تو میں کبھی زائد رسمِ خط کی بات نہیں کروں گا۔ مسلمانوں کو حق ہے کہ وہ جس زبان کے لیے جان دینے کے لیے تیار ہوجاتے ہیں، اس کے حصول اور بقا کے لیے کچھ نہ کریں، جیسا کہ گذشتہ 48 سال کے عمل سے ظاہر ہے۔ مسلمانوں میں تعلیم کا فیصد شاید 26 فی صد ہے۔ اس لحاظ سے جن تین کروڑ مسلمانوں نے اردو کو اپنی زبان بتایا ہے۔ ان میں سے تقریباً ایک کروڑ خواندہ ہیں۔ اگر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مثال کو سامنے رکھا جائے تو ان میں سے ستر فی صد اردو رسمِ خط سے ٹھیک طرح سے واقف نہیں ہیں۔ اس طرح تو ے کروڑ کے اس ملک میں جس میں ہندی سرکاری زبان ہے، کوئی تیس چالیس لاکھ اردو رسمِ خط سے واقف ہوں گے۔ (1991 کی مردم شماری میں اردو زبان والوں کی تعداد تین کروڑ سے گھٹ کر دو کروڑ تیس لاکھ ہوگئی ہے) اب آپ ہی بتائیے آپ کس اکثریت کی بات کررہے ہیں۔''

مسلمان اردو پر اپنی زبان کا ٹھپہ لگائے بغیر اور اس پر حقِ مالکانہ جتائے بغیر بھی اس کی بقا اور ترویج و ترقی کے لیے جدوجہد کرسکتے ہیں۔ اگر آزادی کے بعد مسلمان اپنی تمام توانائی اردو کے لیے صرف کرتے تو آج اردو کی یہ خستہ حالت نہ ہوتی۔ اردو والے سکھ بھائیوں سے سبق لے سکتے ہیں۔ آزادی سے پہلے پنجاب میں بہت کم اسکولوں میں گورمکھی پڑھائی جاتی تھی۔ لیکن پھر بھی ہر سکھ گورمکھی جانتا تھا۔ سکھ عالم فاضل ہو یا ان پڑھ جس نے اسکول کا منہ بھی نہ دیکھا ہو۔ ڈاکٹر، انجینئر ہو یا ٹرک، ٹیکسی ڈرائیور، مزدور ہو یا میکینک وہ اپنے ماں باپ، دوستوں، رشتے داروں کو خط گورمکھی میں ہی لکھتا ہے اور اس کے لیے اسے کسی اسکول کی تعلیم کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ وہ گورمکھی اپنی ماں کی گود میں سیکھتا ہے۔ کیا اردو والے ایسا کچھ انتظام نہیں کرسکتے؟

اردو کی لڑائی خود ان لوگوں سے ہے جو اردو بولتے ہیں، اردو کے مشاعرے پڑھتے ہیں، اردو کی محفلوں میں شریک ہوتے ہیں، اردو کے نام پر روٹی کھاتے ہیں، اردو میں فلمیں لکھ کر ہندی نام سے بیچتے ہیں، اردو کے گانوں پر ہندی سرٹیفکیٹ برداشت کرتے ہیں۔ ان حضرات کے بچے اردو نہیں بولتے، نہیں جانتے، نہیں پڑھتے اور نہیں لکھتے اور نہ خود یہ لوگ چاہتے ہیں کہ ان کے بچے اردو سیکھیں۔ ان کے گھروں میں اردو اخبار نہیں آتے۔ اگر آتے ہیں تو مفت، ہاں انگریزی اور ہندی کے اخبار اور رسالے خرید کر آتے ہیں۔ انگریزی میں چھپی خبر ان کی سمجھ میں آتی ہے۔ اردو میں چھپی خبر کو پرانی اور بکواس کہتے ہیں۔ ان تمام صاحبان سے میری درخواست ہے کہ اردو اخبارات ورسائل اور کتابیں خرید کر پڑھنے کی عادت ڈالیں اور چاہے آپ کسی بھی علاقے میں رہتے ہوں، اردو کے اخبارات و رسائل اپنے ہاکر سے کہہ کر منگوائیں اور ایک نہایت اہم بات — اپنے بچوں کو اردو ضرور پڑھائیں۔

L.C.G. 04, P.H.A.,
Laburnum, Sector-28,
Gurgaon-122002, (Haryana)

❑❑❑

عزیز احمد

# اردو زبان کا تحفظ: چند عملی تجاویز

آج کے حالات میں اردو کو زندہ رکھنے کی ذمے داری بنیادی طور پر اردو معاشرے پر عائد ہوتی ہے۔ ہمیں اردو کے لیے کیا کرنا ہے، اس کا ایک لائحۂ عمل ذیل میں پیش کیا جارہا ہے۔

اپنے گھروں میں اردو کا ماحول بنائیں، اپنے بچوں کو بہرصورت اردو لکھنا پڑھنا سکھائیں۔ خود اردو لکھنا پڑھنا نہ جانتے ہوں تو پہلی فرصت میں سیکھ لیں۔ اگر اسکول میں اردو پڑھانے کی سہولت نہ ہو تو اپنے بچوں کو گھر پر اردو لکھنا پڑھنا سکھائیں۔ ہر گھر میں ایک اردو اخبار خرید کر پڑھا جائے۔ ہر گھر میں اردو کتابیں خصوصاً بچوں کے مطالعے کے لائق اردو کتابیں اور رسالے خریدے جائیں۔ اپنے خطوط اردو میں لکھیں اور پتہ بھی اردو ہی میں لکھ کر ڈاک میں ڈالیں۔ سرکاری دفتروں میں درخواستیں اردو میں لکھ کر دیں۔ بینکوں میں دینے کے لیے چیک اور واؤچر اردو میں بھریں۔ ہر اردو جاننے والا کم از کم ایک اردو ناخواندہ شخص کو اردو لکھنا پڑھنا سکھائے۔ ہر گھر میں کم از کم ایک اردو رسالہ خریدا جائے خواہ ادبی، خواہ سیاسی، خواہ مذہبی۔ اردو والوں کو اردو کے دفتری استعمال کے حق کو عملی بنانے کے لیے آمادہ کیا جائے اور اردو کے استعمال کے قانونی حق کو عملی بنانے میں غیر مشروط تعاون حاصل کرنے کی پوری کوشش کی جائے۔ اردو میڈیم سے ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ، بی اے، بی ایس سی اور بی کام کے امتحانات فاصلاتی طریقے سے پاس کرنے کے مواقع سے فائدہ اٹھایا جائے اور اس مقصد کے لیے نیشنل اوپن اسکول اور مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کی فراہم کردہ سہولیات سے استفادے کی راہیں نکالی جائیں۔ جن بچوں کی تعلیم چھوٹ جاتی ہے ان کی مدد کرنے کا اس سے بہتر کوئی اور طریقہ نہیں ہے کہ ہمارے اسکول، کالج اور مدرسے نیشنل اوپن اسکول اور مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد کے سینٹر اپنے یہاں قائم کرکے ان اداروں کے تعلیمی پروگرام سے استفادہ کرنے کی سہولیات کو ان کی پہنچ میں لے آئیں۔

لوگوں میں اردو اخبارات ورسائل اور کتابیں پڑھنے کے شوق کو بڑھاوا دیا جائے۔ اردو زبان سکھانے کے لیے رضا کارانہ کلاسیں لگانے کا اہتمام کیا جائے اور جہاں جہاں ممکن ہو اردو سکھانے کے پروگرام کو تعلیم بالغان کی سرکاری/غیر سرکاری اسکیموں سے جوڑا جائے۔

تعلیم یافتہ نوجوانوں میں اردو سیکھنے کی آمادگی پیدا کی جائے۔ اردو نشستوں کا اہتمام کیا جائے اور ان میں ہندی کے ادیبوں اور شاعروں کو شامل کیا جائے۔ محلوں میں اردو ریڈنگ روم قائم کیے جائیں اور اردو لائبریریاں قائم کی جائیں اور ان کے لیے سرکاری/نیم سرکاری اداروں اور عام لوگوں کا تعاون حاصل کیا جائے۔ اپنے شہر میں اردو کی درسی اور غیر درسی کتابوں کی فراہمی کے لیے کتب فروشوں سے رابطہ کیا جائے۔ مقامی تعلیمی اداروں میں اردو کے شعبے قائم کرانے کی کوشش کی جائے اور دینی مدارس میں رائج اردو تعلیمی پروگرام اور طریقۂ تعلیم پر نظرثانی کرنے اور کارگر انداز سے اردو پڑھانے کی راہیں ہموار کی جائیں تاکہ مدارس کے نظامِ تعلیم میں اردو کو کلیدی مقام حاصل ہوسکے۔ اقلیتی تعلیمی اداروں یعنی مدرسوں، پرائمری اور جونیر اسکولوں میں باہمی ربط قائم کیا جائے اور ان میں درج ذیل مقاصد کے حصول کی کوشش کی جائے۔ ہر ادارہ یا تو اردو میڈیم بنے یا اس میں اردو کو ایک زبان کی حیثیت سے موثر ڈھنگ سے پڑھایا جائے۔ ہر ادارہ ایک اردو لائبریری قائم کرے جس میں بیشتر کتابیں بچوں کے لیے ہوں۔ ہر اقلیتی ادارے میں ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' کو بھی ایک قومی گیت کی حیثیت سے گایا جائے۔ اردو زبان کی تدریس جدید لسانیاتی خطوط پر کی جائے اور اسے موثر اظہار کے ذریعے کے طور پر سکھایا جائے۔ اردو ٹیچروں کے لیے قلیل المدت تربیتی کورس منظم کیے جائیں۔ ان تعلیمی اداروں کے مابین تقریر و تحریر کے مقابلے منعقد کیے جائیں۔ ہر ادارے میں ہر صبح پڑھائی شروع ہونے سے پہلے بچے کی دعا ''لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری'' اجتماعی طور پر گائی جائے۔ اردو اور ہندی کے درمیان رابطے کی راہیں تلاش کی جائیں اور دونوں زبانوں کے مابین زبان ادبی لین دین کو فروغ دیا جائے۔ اردو زبان و ادب میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور قومی یکجہتی کی جو روایت موجود ہے اسے آگے بڑھانے اور مضبوط تر کرنے کی موثر کوششیں کی جائیں۔

اردو معاشرے کے افراد کو اس پر آمادہ کیا جائے کہ گھر میں ہر کمانے والا شخص اپنی ماہانہ آمدنی کا کم از کم ایک فی صد اردو زبان اور ثقافت کے تحفظ پر صرف کرے۔

اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے کام کرنے والے تمام سرکاری اور غیر سرکاری اداروں سے ربط رکھا جائے اور ان سے جو تعاون مل سکتا ہو وہ حاصل کیا جائے۔ یہ وہ کام ہیں جو ہمیں خود انجام دینے ہیں، کچھ معاملات میں ہمیں حکومت سے رجوع کرنا چاہیے، مثلاً:

تعلیم، صحافت اور دفتری استعمال کے شعبوں میں ایک مربوط حکمتِ عملی

مرتب کرنے اور اس پر عمل درآمد کے لیے حکومت کو آمادہ کرنا۔

ان ریاستوں کے علاوہ جہاں اردو کو قانونی حیثیت حاصل ہے ہر اُس ریاست میں جہاں اردو والوں کی قابلِ لحاظ آبادی ہے، آئینی تحفظات کا استعمال کرا کے اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دلایا جائے اور اس کی حیثیت سے اس کے جملہ حقوق کی عملی ضمانت حاصل کی جائے۔

ملک کے تعلیمی نظام میں اردو کو جائز اور منصفانہ مقام دلانے کے لیے حکومت اس پر آمادہ کرنا کہ وہ تعلیمی سہولتوں کو وہاں وہاں پہنچائے جہاں جہاں اردو والے رہتے ہیں اور اس مقصد کے لیے پرائمری اور سیکنڈری اسکول کھولے۔ اپنے مطالبات کو اساس اور قوت فراہم کرنے کے لیے ''اردو تعلیمی سروے کمیٹی'' بنا کر زبان کی بنیاد پر ہر گاؤں اور شہر/محلہ/وارڈ کا تعلیمی سروے کریں۔ سروے کا خاکہ مقامی حالات کی روشنی میں بنایا جائے۔

اردو تعلیمی سروے سے حاصل ہونے والے اعداد و شمار کو بلاک، تحصیل اور ضلع کی بنیاد پر یکجا کر کے ضلع وار میمورنڈم مرتب کیا جائے اور اسے بیسک ادھیکاری/ضلع انسپکٹر آف اسکولز کو پیش کیا جائے اور اس کو میمورنڈم کی نقلیں ریاستی وزیرِ تعلیم اور وزیرِ اعلا کو بھیجی جائیں۔

اردو آبادی میں پرائمری اور سیکنڈری اسکول کھلوانے کے ساتھ ساتھ حکومت کو درج ذیل سہولیات کی فراہمی کے لیے آمادہ کیا جائے۔

ہر سطح کے اردو ٹیچروں کی طویل مدت ٹریننگ کا انتظام کرنا۔

اردو درسی کتابوں کی تیاری، چھپائی اور تقسیم کا معتبر نظام قائم کرنا۔

اسکولوں کے لیے مستقل عمارتیں فراہم کرنا۔

اردو لائبریریوں کے قیام میں مدد دینا اور پہلے سے قائم لائبریریوں کو جاری رکھنے میں مدد کرنا۔

اردو ٹیکنیکل/ٹیکنالوجیکل تعلیم کے دائرے کو وسیع کرنا۔

اردو اکادمیوں کو ادب کے فروغ کے ساتھ ساتھ اردو زبان اور صحافت کے فروغ کے لیے سہولتیں دینا۔

اس کی غیر معمولی کارکردگی کے پیشِ نظر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے دائرۂ کار کو وسیع تر کرنا۔ ادارے کی حیثیت سے اسے زیادہ با اختیار بنانا اور زیادہ مالی گرانٹ فراہم کرنا۔

پیشہ ورانہ تعلیم کے اردو میڈیم اداروں کو مرکزی یونیورسٹیوں سے براہ راست الحاق کی سہولت فراہم کرنا۔

اردو اخبارات و رسائل کی مالی مدد کرنا اور ہر معاملے میں اردو صحافت کو دوسری لسانی صحافتوں کے برابر درجہ دینا۔

جیسا کہ عرض کیا گیا تعلیمی سروے کا خاکہ مقامی حالات کی روشنی میں بہتر طور پر تیار ہو سکتا ہے، تاہم اس کی ایک شکل درج ذیل ہو سکتی ہے:

1. کل آبادی؟ ..............................
2. کتنی آبادی کی مادری زبان اردو ہے؟ ..............................
3. اردو آبادی میں پانچ سے دس سال تک کی عمر کے بچوں کی تعداد؟ ..............................
4. 300 بچوں پر ایک اسکول کے حساب سے کل پرائمری اسکولوں کی ضرورت؟ ..............................
5. کتنے اسکول موجود ہیں؟ ..............................
6. کتنے مزید اسکول کھولے جائیں؟ ..............................
7. ان اسکولوں کے لیے 40 بچوں پر ایک ٹیچر کے تناسب سے کل کتنے ٹیچر درکار ہوں گے؟ ..............................
8. کتنے ٹیچر موجود ہیں؟ ..............................
9. کتنے مزید ٹیچر مہیا کرائے جائیں؟ ..............................

Sirsyed Public School, 8 Awas Vikas Colony,
Bulandsheher, Hapur-245101 □□□

''اردو دنیا'' اور ''فکر و تحقیق'' کے سالانہ خریدار بنیں

**''اردو دنیا''** اردو کے حال اور مستقبل کا آئینہ ہے---خود بھی مطالعہ کریں اور اپنے احباب کو بھی اس کے مطالعے کی ترغیب دیں۔
سالانہ قیمت:100 روپے بذریعہ ڈرافٹ، منی آرڈر یا چیک

ماضی کی علمی بازیافت اور حال کی علمی فتوحات سے واقفیت کے لیے **''فکر و تحقیق''** کا مطالعہ کریں۔ سالانہ قیمت:100 روپے
بذریعہ ڈرافٹ، منی آرڈر یا چیک

National Council for Promotion of Urdu Language, New Delhi
کے نام درج ذیل پتے پر روانہ کریں: (دہلی سے باہر کے لوگ -/110 روپے کا چیک بھیجیں)
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

محمد شاہد حسین

# اردو سینما 1947 تک

1912 تک ہندستان میں فلمیں خال خال ہی بنتی تھیں، زیادہ تر فلمیں باہر سے آتی تھیں۔ ان میں بھی فرانس کی زیادہ تھیں۔ لیکن امریکہ، اٹلی، برطانیہ، ڈنمارک اور جرمنی بھی ہندستانی فلمی بازار میں اپنی حصے داری کے لیے کوشاں تھے۔ کیوں کہ ہندستان عالمی پیانے پر فلم کی اچھی منڈی تھا۔

تبھی ہندستانی فلمی دنیا میں ایک غیر معمولی شخصیت نمودار ہوئی اور وہ تھے ڈھنڈی راج گووند پالکے۔ جو دادا صاحب پالکے کے نام سے زیادہ جانے جاتے ہیں۔ دادا صاحب کو حضرت مسیح کی زندگی پر انگریزی فلم دیکھ کر شری کرشن کے حالاتِ زندگی پر فلم بنانے کا خیال آیا، لیکن کچھ مجبوریوں کی بنا پر وہ شری کرشن پر فلم نہ بنا سکے۔ ان کی پہلی فلم ''راجہ ہریش چندر'' کے نام سے بنی۔ یہ 1912 میں مکمل ہوئی۔ یہ اپنے وقت کی سب سے لمبی فلم تھی یعنی اس کی لمبائی 3700 فٹ تھی۔ یہ 1913 کی ابتدا میں ممبئی کے کارونیشن سینما گھر میں پہلی بار دکھائی گئی اور بے حد کامیاب ہوئی۔ دادا صاحب نے مختصر اور پوری لمبائی کی سیکڑوں فلمیں بنائیں جن میں بھیشم سوداموہنی، ساوتری، لنکا دہن اور کرشن جنم کافی مشہور ہوئیں وہ زیادہ تر مذہبی فلمیں بناتے تھے۔ پروہت خاندان کے ہونے کی وجہ سے انھیں اس موضوع پر زیادہ قدرت حاصل تھی، انھوں نے ہندستان اور ہندستان سے باہر برما، سری لنکا اور ایسٹ افریقہ میں ہزاروں کامیاب شو کیے اور ہر جگہ دھوم مچا دی۔

مذہبی فلموں کا دور قریب قریب 1920 تک چلتا رہا۔ اس کے بعد سماجی، تاریخی اور نیم تاریخی فلمیں بننے لگیں تو مذہبی فلموں کا زور کم ہو گیا۔ دادا صاحب پالکے 1944 تک زندہ رہے مگر 1920 کے بعد انھوں نے بہت کم فلمیں بنائیں۔

اسی دور میں دو اہم فلمی شخصیتیں کلکتے سے ابھریں۔ دھرین گنگولی اور دیبکی کمار بوس۔ ہندستانی فلم کی تاریخ میں گنگولی کی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ انھوں نے ہندستان میں مزاحیہ فلموں کی ابتدا کی۔ ان کی مزاحیہ فلموں میں میرج ٹانک، لیڈی ٹیچر اور انگلینڈ رٹرن کافی مشہور ہوئیں۔

دیبکی کمار بوس نے اسکرپٹ بھی لکھے۔ اداکاری بھی کی اور ڈائرکٹر کی حیثیت سے ہندستانی فلموں کو خصوصی رنگ و آہنگ بخشا، وہ پس منظر موسیقی اور صوتی اثرات کے بھی ماہر تھے۔

اس عہد میں ایک اور فلمی شخصیت ممبئی کے چندو لال شاہ تھے۔ انھوں نے کل 130 فلمیں بنائیں۔ جن میں سے ساٹھ فلموں سے بہت اچھا منافع ہوا۔ یہ سب کی سب سماجی فلمیں تھیں۔ یہی وہ فلمیں ہیں جنھوں نے سماجی فلموں کو مذہبی فلموں پر فوقیت دلوائی۔ چندو لال شاہ نے جس قسم کی فلمیں بنائیں ان سے بہت سے فلم سازوں کو رہنمائی ملی۔

1927 میں پورے ہندستان میں 265 پکچر ہال تھے۔ اس کی وجہ سے ہندستانی فلموں کی مانگ بڑھی۔ مگر ہندستانی فلمی صنعت اس مانگ کو پورا کرنے میں کامیاب نہیں ہوئی۔ غیر ملکی فلموں کی سپلائی بھی یقینی نہیں تھی، انھیں سب پریشانیوں کی وجہ سے بہت سے سینما ہال بند ہو جاتے تھے۔

پہلی جنگِ عظیم کے شروع ہونے سے پہلے تک ہندستانی فلمی بازار پر فرانس حاوی تھا، امریکہ اور برطانیہ وغیرہ کا حصہ بہت کم تھا۔ مگر پہلی جنگ عظیم چھڑی تو فرانس، اٹلی اور جرمنی میں فلمیں بننا قریب قریب بند ہو گئیں۔ برطانیہ میں بھی کساد بازاری کی وجہ سے کم ہی فلمیں بن پا رہی تھیں، مگر ناظرین ہر جگہ پہلے ہی کی طرح موجود تھے، اور ان کی فلموں کی پیاس بھی ویسی ہی تھی، اس موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے امریکن فلم سازوں نے بڑے پیانے پر پروڈکشن شروع کر دیا۔ پہلی جنگِ عظیم کے دوران میں امریکہ نے ایک اور کام یہ کیا کہ فلم تقسیم کرنے کا طریقۂ کار متعین کر دیا، اسی زمانے میں چارلی چپلن اور میری پگ فورڈ جیسے اداکار پیدا ہوئے جن کی وجہ سے امریکن فلموں کو عالمی شہرت حاصل ہوئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پہلی جنگِ عظیم ختم ہوتے ہوتے یعنی 1918 کے قریب ہالی ووڈ دنیا کا فلمی پایۂ تخت بن چکا تھا۔ ایک اندازے کے مطابق 1925 میں پورے برطانوی اسکرین ٹائم کا 95 فیصد وقت امریکن فلموں کے قبضے میں تھا اور فرانس میں بھی یہی صورتِ حال تھی۔[1] 1926-27 میں ہندستان میں بھی جو فلمیں ریلیز ہوتی تھیں ان میں صرف پندرہ فی صد ہندستانی ہوتی تھیں 85 فیصد غیر ملکی وہ بھی زیادہ تر امریکن۔

اسی صورتِ حال میں ہندستان میں متکلم فلموں کی ابتدا ہوئی اور 1931 میں پہلی ہندستانی متکلم فلم ''عالم آرا'' تیار ہوئی۔ مگر متکلم فلموں کے ساتھ زبان کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ خاموش فلمیں پورے ہندستان بلکہ برما، ملایا، سنگاپور اور سری لنکا کے لیے بھی ہوتی تھیں ان میں زبان کا کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ ہندستان مختلف لسانی اکائیوں میں بٹا ہوا ہے اور کوئی ایک زبان ایسی نہیں ہے جو پورے ہندستان میں بولی اور سمجھی جاتی ہو، لہٰذا یہ مسئلہ سامنے آیا کہ اب

جس زبان میں بھی فلم بنے گی اس کے ناظر محدود ہو جائیں گے۔ پھر بھی متکلم فلمیں تیزی سے بنیں اور خوب کامیاب ہوئیں۔ "عالم آرا" جب پہلے پہل ممبئی کے ایک سنیما ہال میں دکھائی گئی تو مجمع کو قابو میں رکھنے کے لیے پولیس کی مدد لینی پڑی اور چار آنے والے ٹکٹ چار روپے میں بلیک ہوئے دوسرے شہروں میں بھی یہی حال ہوا۔[2]

1931 میں بائیس فلمیں اردو میں، تین بنگالی میں، ایک ایک تلگو اور تامل میں بنیں۔ 1933 میں اردو میں پچھتر فلمیں بنیں اور دوسری زبانوں کی فلموں کی تعداد بھی بڑھی۔

ابتدائی دور کی تمام متکلم فلمیں تجارتی نقطۂ نظر سے بہت کامیاب ہوئیں۔ ان فلموں کی کامیابی کا راز کیا تھا۔ پہلی چیز تو یہ کہ مادری زبان یا ایک ایسی زبان کے استعمال نے جو ان کی بول چال کی زبان تھی، عوام کو مسحور و سرمد کردیا۔ اس سے ناظرین غیر معمولی طور پر متاثر ہوئے۔ غیر ملکی فلموں کی زبان کم لوگ سمجھ پاتے تھے۔ پھر ان کی تہذیب و معاشرت بھی مختلف ہوتی تھی اور نظریۂ زندگی بھی مختلف تھا۔ لہٰذا یہاں کا عام ناظر ان سے پوری طرح لطف اندوز نہیں ہو پاتا تھا۔ ہندستانی فلموں کے منظر، ماحول، طرزِ زندگی، رسم و رواج اور طور طریقے ان سب سے یہاں کا عام ناظر مانوس ہوتا تھا پھر ان فلموں کی کہانیوں میں ان کی اپنی زندگی کی پرچھائیاں ہوتی تھیں جن میں وہ زیادہ کشش محسوس کرتے تھے۔ ہوسکتا ہے مغربی فلمیں تکنیکی، فنی اور ادبی نقطۂ نظر سے زیادہ بہتر رہی ہوں۔ مگر زبان کی اجنبیت کی وجہ سے ان میں زیادہ لطف نہیں آتا تھا۔

اس وقت فلم ایک متحیر کردینے والی چیز تھی۔ ابتدا میں تصویر جامد سے متحرک ہوئی تو یہی بہت بڑا عجوبہ تھا۔ لوگ صرف یہ دیکھنے کے لیے ٹوٹ پڑتے تھے کہ ریل پردے پر کیسے دوڑ رہی ہے۔ جہاز کیسے اڑ رہا ہے متکلم فلموں کا دور شروع ہونے پر جب ریل سیٹی بجانے لگی، جہاز گھڑگھڑانے لگا اور انسان ہنسنے رونے، چیخنے چلانے لگا تو تحیر و مسرت کی انتہا نہ رہی اور یہ ابتدائی ہندستانی متکلم فلمیں اپنی فنی و تکنیکی کمزوریوں کے باوجود کامیاب رہیں۔

اس وقت موسیقی، رقص، شاعری اور اداکاری تھیٹر اور تھیٹر سے الگ بھی عوامی تفریح کا ایک بڑا ذریعہ تھی۔ ان چیزوں کو فلموں میں بڑے پیمانے پر استعمال کیا گیا۔ یہاں رقص، موسیقی اور ڈراموں کی روایت ہزاروں سال سے موجود تھی اور لوگوں کے مزاج میں رچی بسی ہوئی تھی۔ فلموں میں یہ روایت ایک نئی قوت اور زور کے ساتھ آگے بڑھی اور یہاں کے ناظرین کو مسحور کرگئی۔

متکلم فلموں کے ابتدائی دور میں ہندستانی فلمی صنعت کے ارتقا میں تین فلم کمپنیوں کا بہت اہم رول ہے۔ ان میں ایک ہے "نیو تھیٹرز لمیٹڈ" جو ٹالی گنج کلکتہ میں 1930 میں قائم ہوئی۔ اسے قائم کرنے والے نریندر ناتھ سرکار تھے۔ اس کمپنی نے بہت تیزی سے ترقی کی۔ نریندر ناتھ سرکار نے اپنی اس کمپنی کے لیے دیبکی بوس کی خدمات حاصل کیں جن کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ ان کی فلم "سیتا" پہلی ہندستانی فلم تھی جو وینیس کے فلم فیسٹیول میں دکھائی گئی۔ اس کمپنی سے پرنس بروا بھی وابستہ ہے۔ جنھوں نے شرد چند چٹرجی کے بنگلہ ناول پر منحصر فلم "دیوداس" پہلے بنگلہ پھر اردو میں اس طرح ڈائرکٹ کی کہ اردو سماجی فلموں کے نظریے میں انقلاب برپا ہوگیا۔

دوسری فلم کمپنی جس نے ابتدائی متکلم فلمیں بنائیں، پربھات فلم کمپنی تھی۔ یہ کمپنی 1929 میں کولھاپور میں وی.شانتا رام نے چار حصے داروں کی مدد سے قائم کی۔ 1936 میں وی.شانتا رام نے فلم "امرجوتی" بنائی جسے وینیس فلم فیسٹیول میں دکھایا گیا۔ اس کمپنی نے 1936 میں ہی "سنت تکارام" مراٹھی میں بنائی۔ جس کی ہدایت ایس فتح لال نے دی تھی۔ جو اس کمپنی کے ایک حصے دار تھے۔ یہ پہلی ہندستانی فلم ہے جسے وینیس فلم فیسٹیول میں ایوارڈ ملا۔

وی.شانتا رام سماجی فلموں میں انوکھے پن، اور نئے نئے تجربات کے لیے جانے جاتے ہیں دراصل اس وقت عوام کی مانگ (جس کا پتہ اخبارات اور فلم تقسیم کاروں کے ذریعے چلتا تھا) سماجی حقائق پر مبنی فلموں کی تھی۔ شانتا رام یہ مانگ پوری کررہے تھے یہی ان کی مقبولیت کا سبب تھا۔

تیسری فلم کمپنی کی بنا دیوکا رانی اور ہمانشو رے نے ڈالی۔ یہ دونوں رشتۂ ازدواج میں منسلک تھے۔ ہمانشو رے نے پہلے غیر ملکی فلم سازوں کے ساتھ مل کر فلمیں بنائیں، پھر ممبئی آگئے۔ یہاں ایک بڑا اسٹوڈیو بنوایا۔ جدید سے جدید تر آلات اور مشینیں حاصل کیں کچھ ٹکنیشین جرمنی سے لائے اور کچھ آرٹسٹ یہاں سے لے کر ایک بڑی ٹیم بنائی اور نیو تھیٹرز اور پربھات کی طرح "بامبے ٹاکی لمیٹڈ" کے نام سے ایک ہرز اویے سے مکمل اور خود کفیل کمپنی وجود میں آگئی۔

ہمانشو رے اور دیوکا رانی نے ایک ٹریننگ پروگرام شروع کیا۔ پڑھے لکھے نوجوانوں کا انٹرویو کے ذریعے انتخاب کرکے انھیں ٹریننگ دینے لگے اور جلد ہی اس کمپنی کے تربیت یافتہ نوجوانوں کے نام ہندستان گیر شہرت حاصل کرنے لگے۔ ان نوجوان اداکاروں میں اشوک کمار، راج کپور، دلیپ کمار، ڈائرکٹر ایس مکرجی اور رائٹر کے.اے. عباس شامل تھے۔

متکلم فلموں کے ابتدائی دس برسوں میں علاقائی سرپرستی نے فلمی صنعت کو کافی متاثر کیا۔ اس سلسلے میں عموماً دو رجحانات ملتے ہیں۔ ایک تو مخصوص لسانی علاقے میں اپنا پروڈکشن سینٹر بنانا۔ مثلاً ابتدا میں مدراس میں ساؤنڈ پروڈکشن مشین یا اسٹوڈیو نہیں تھے۔ لہٰذا انھیں ممبئی اور کلکتے کا سہارا لینا پڑتا تھا۔ جب ممبئی اور کلکتے میں بنی تامل تلگو فلموں کے پروڈیوسروں نے بھاری منافع

حاصل کیا تو دکن میں جدید طرز کے اسٹوڈیو تعمیر ہونے لگے۔ ایسے اسٹوڈیو 1935-36 میں مدراس، سالم اور کوئمبٹور میں بنے۔

دوسرا رجحان یہ تھا کہ لوگ تین بڑے سینٹروں سے ہی ملحق رہنا پسند کرتے تھے۔ یہ سینٹر اپنی علاقائی زبانوں کے ساتھ ساتھ دوسری زبانوں کی فلمیں بھی بناتا تھا۔ ممبئی کے مقابلے میں کلکتے میں یہ رواج زیادہ تھا وہ ایک سیٹ پر ایک ہی فلم کو دو زبانوں میں شوٹ کر لیتے تھے۔ گوکہ کاسٹ بدل جاتی تھی پھر بھی بہت سا خرچ بچ جاتا تھا۔ مثلاً ایک ہی رقص دونوں میں استعمال ہو جاتا تھا۔[3]

چوتھی دہائی کی ابتدا میں ممبئی کلکتہ اور مدراس میں بہت سی بڑی اور کامیاب فلم کمپنیاں قائم ہو چکی تھیں مگر ان کمپنیوں کی تفصیل میں جانے سے زیادہ اہم یہ ہے کہ اس دور میں فلم انڈسٹری سے متعلق لوگوں کی توجہ اس صنعت کو منظم کرنے کی طرف ہوئی۔ لہٰذا 1935 میں ''اے موشن پکچر سوسائٹی آف انڈیا'' قائم ہوئی۔ اس سے متاثر ہو کر علاقائی یا صوبائی سطح پر بھی تنظیمیں بنیں، ہر تنظیم اپنا ایک رسالہ یا خبرنامہ نکالتی تھی اور چوتھی دہائی کے اختتام تک اس صنعت سے متعلق اڑسٹھ رسالے نکل رہے تھے جس میں آدھے انگریزی کے تھے بقیہ ہندستانی زبانوں کے۔[4]

1930 تک ہندستانی فلم صنعت میں سب سے زیادہ اہمیت پروڈیوسر اور ڈائرکٹر کی ہوتی تھی۔ اداکار صرف نوکر ہوتا تھا۔ زیادہ تر کمپنیوں کا اپنا اسٹوڈیو، اپنی لیباریٹریز اور اپنا عملہ ہوتا تھا۔ مگر 1940 میں ڈفنس ڈپارٹمنٹ کی نئی سرمایہ کاری کی وجہ سے نئے نئے پروڈیوسر میدان میں آگئے۔ ان کے پاس اپنا کوئی سازوسامان نہیں ہوتا تھا، وہ تمام چیزیں کرائے پر لیتے تھے۔ انھوں نے اداکاروں، گلوکاروں اور فنکاروں سے ایک ایک فلم کے لیے معاہدہ کرنا شروع کیا۔ لہٰذا یہ تمام لوگ فلم کمپنیوں کی نوکریاں چھوڑ کر آزاد پیشہ اختیار کرنے لگے۔ اور 1941 تک آتے آتے نوبت یہاں تک پہنچی کہ اچھے اداکار ایک ساتھ چار چار فلموں میں کام کرنے لگے۔

دوسری جنگِ عظیم کے دوران برطانوی گورنمنٹ نے جنگی پروپیگنڈے پر ڈاکومنٹری اور نیوز ریل بنوانا شروع کیں اور انھیں ہر سنیما گھر کے ہر شو میں دکھانا ضروری قرار دیا۔ اس سے بھی فلم صنعت کو کچھ نہ کچھ فائدہ ہی ہوا۔ جنگ کے دوران ذخیرہ اندوزی اور بلیک مارکٹنگ سے کچھ لوگوں کے پاس کافی ناجائز دولت اکٹھا ہوگئی تھی۔ اس کا استعمال دوسری جگہوں کی بہ نسبت فلم میں زیادہ آسان تھا۔ لہٰذا اس سے بھی فلم کے معیار اور ان کی تعداد پر مثبت اثرات پڑے۔

1947 کے بعد ہندستانی فلم صنعت مختلف قسم کے نشیب و فراز سے گزرتی رہی کبھی ٹیکس کا بوجھ بڑھا، کبھی سنسر کا شکنجہ کسا، مگر اس وقت سے آج تک کوئی چیز اس کی ترقی کو نہیں روک سکی اور نہ ہی فلموں کی مقبولیت میں کوئی کمی آئی۔ آج بھی یہ عوامی تفریح کا مقبول ترین ذریعہ ہے۔

## حواشی:


1. Balcon E.T., Twenty Years of Birtish Film, 1947, London, P.13.
2. Erikbarnovw, S. Krishnaswamy, Indian Film, New york, 1963, P 64.
3. Ibid, P. 100.
4. Indian Cinematograph, Year Book. 1938. P.14.



پتہ:

C.I.L. School of Languages, JNU, New Delhi-67



**دل کی گیتا**

**مدوّن: مخمور سعیدی**

''شریمد بھگوت گیتا'' ہندستان کا وہ الہامی صحیفہ ہے جس کے ترجمے دنیا کی کئی زبانوں میں ہوئے ہیں۔ اردو میں بھی اس کے تراجم ہوتے رہے ہیں لیکن خواجہ دل محمد کا یہ ترجمہ گیتا کا بہترین ترجمہ ہے جو اردو نظم میں کیا گیا ہے۔— ترجمے میں بہت سے مقامات پر کثیر المعانی الفاظ آئے ہیں، خواجہ صاحب نے ایسے تمام مقامات پر حاشیے میں وہ معنی درج کردیے ہیں جو وہاں مطلوب ہیں۔ جہاں جہاں ضروری سمجھا ہے حواشی میں مطالب کی تفسیر وتوضیح بھی کرتے گئے ہیں۔

صفحات: 240، قیمت: -/92 روپے

**یونانی ادویہ مفردہ**

**مصنف: حکیم سید صفی الدین علی**

طب یونانی میں دو طرح کی ادویہ استعمال کی جاتی ہیں، مفرد اور مرکب۔ اگر طبیب مرض کی علامات کی بہتر تشخیص کرلے تو مفرد ادویہ کے ذریعے بڑی آسانی سے علاج کرسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حکیموں نے مرکبات کی بجائے مفردات کے استعمال پر ہمیشہ زور دیا ہے۔ اس کتاب میں 334 ادویہ کی تفصیل درج کی گئی ہے جس میں مختلف فواکہات اور میوہ جات سے لے کر انواع واقسام کی جڑی بوٹیاں اور پودے بھی شامل ہیں۔

صفحات: 365، قیمت: -/70 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

**قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان**

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر.کے. پورم، نئی دہلی-110066

تحریر: مینا کشی
مترجم: محمد نوشاد عالم

# مسئلہ بچوں کی تعلیم و تربیت کا

ساتویں کلاس کی طالبہ، پریا، کافی تیز دماغ لڑکی ہے۔ کلاس میں ہمیشہ اوّل آتی ہے جس کی وجہ سے نہ صرف والدین بلکہ اساتذہ کی بھی عزیز ہے لیکن گذشتہ کچھ دنوں سے امتحانوں میں اس کے نمبر کم آنے لگے ہیں۔ جن سوالوں کو وہ فوراً حل کر دیتی تھی، اب لاکھ کوشش کے باوجود حل نہیں کر پاتی، اس کے علاوہ مطالعے کے دوران اسے بہت سی تکالیف سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس رویے کی وجہ سے وہ ہمیشہ گم صم رہنے لگی ہے۔ اکثر پڑھنے کے وقت پیٹ اور سر میں درد کی شکایت کرنا اس کی عادت بن گئی ہے۔ اس کے والدین بھی اس میں آنے والی اس اچانک تبدیلی کو لے کر پریشان ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ پہلے جہاں وہ گھنٹوں مطالعہ کرتی تھی، اب وہ دن بھر ٹیلی ویژن اور انٹرنیٹ سے چپکی رہتی ہے اور کچھ کہنے پر غصہ ہو جاتی ہے۔

ایک پبلک اسکول کا طالب علم ناصر، صبح سات بجے گھر سے نکلتا ہے۔ اسکول واپسی سے کھانا کھانے تک اس کا ٹیوشن جانے کا وقت ہو جاتا ہے۔ پھر رات آٹھ بجے تک گھر واپس آتا ہے اور اس کے بعد اسکول و ٹیوشن کا ہوم ورک پورا کرنے کا دباؤ رہتا ہے۔ مشکل ہی سے اسے ٹی.وی. دیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ یہی اس کا روز کا معمول ہے۔ لیکن اس کے والدین کا کہنا ہے کہ گذشتہ کچھ دنوں سے پڑھائی کا نام لیتے ہی وہ ناک بھوں چڑھا لیتا ہے اور بڑبڑانا شروع کر دیتا ہے اور ہر وقت ٹی.وی. سے چپکا رہتا ہے۔ اس کے علاوہ اسے بھوک اور نیند بھی کم آنے لگی ہے۔

دارالحکومت کے زیادہ تر بچے تعلیم کے قدیم طور طریقے اور والدین کی بڑی بڑی خواہشوں کی وجہ سے جھلاہٹ محسوس کرنے لگے ہیں۔ ماہرینِ نفسیات کا کہنا ہے کہ بچوں میں یہ جھلاہٹ اب مختلف جسمانی تکالیف مثلاً سر اور پیٹ درد، گھبراہٹ، بھوک نہ لگنا، دورے پڑنا وغیرہ کی صورت میں ظاہر ہو رہی ہے۔ بچوں کا بڑھتا ذہنی تناؤ قوتِ برداشت کم ہونے کی وجہ سے مختلف جسمانی علامات کی شکل میں ظاہر ہو رہا ہے۔ دراصل یہ دونوں بچے بھی تعلیم کے دباؤ سے پریشان ہیں۔ آئیڈیل چائلڈ سنڈروم (بچوں کو مثالی بنانے کا رجحان) کے شکار والدین بچوں کو اسپیشل کڈ (Special Kid) سے اسمارٹ کڈ (Smart Kid) اور اسمارٹ کڈ سے سوپر کڈ (Super Kid) بنانا چاہتے ہیں۔ ماہر نفسیات پروفیسر ڈاکٹر تیج بہادر سنگھ کا خیال ہے کہ آج والدین نے اپنے بچوں سے بہت زیادہ امیدیں وابستہ کر لی ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کا بچہ راتوں رات سوپر اسٹار بن جائے۔ لیکن اس دباؤ کی وجہ سے بچوں کے بچپن کے ساتھ ساتھ ان کی معصومیت ختم ہوتی جا رہی ہے۔ والدین اپنے خوابوں اور خواہشوں کی تکمیل بچوں کے ذریعے کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے وہ انھیں کھیلنے کا وقت نہیں دیتے اور کھانا کھلا کر سلانا اور اٹھتے ہی مطالعے کے لیے کہنا، یہ ساری باتیں کئی بار انھیں ٹنشن کا شکار بنا دیتی ہیں۔ اس سے بچوں کی پرفارمنس بھی خراب ہو جاتی ہے۔

پہلے نصاب عام طلبہ کی ذہنی سطح کو مدِ نظر رکھ کر تیار کیا جاتا تھا لیکن جیسے جیسے مقابلے کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ نصاب کو بھی صلاحیت کے حساب سے بنایا جا رہا ہے۔ نتیجتاً ضرورت سے زیادہ ہوم ورک، ہر ہفتے یونٹ ٹیسٹ اور امتحان کا دباؤ ہمیشہ بنا رہتا ہے۔ اس پر بھی والدین بچے کی صلاحیت کا اندازہ کیے بنا اس سے ہر میدان میں اوّل رہنے کی امید رکھتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں بچے پڑھائی کے نام سے ہی کترانے لگتے ہیں۔ گیارہ فی صد لڑکے اور آٹھ فی صد لڑکیاں اس پریشانی کا شکار ہیں۔

ماہر نفسیات ڈاکٹر جیتندر ناگپال کا کہنا ہے کہ پڑھائی میں دل نہ لگنے کی پریشانی نہ صرف عام طلبہ بلکہ زیادہ تر ذہین طلبہ میں بھی 15 سے 20 فیصد دیکھی جاتی ہے۔ آج زیادہ تر والدین بچوں کے ذریعے معاشرے میں اپنی پہچان بنانا چاہتے ہیں جس کے لیے وہ ہر وقت اپنے بچوں کو پڑھنے کے لیے ڈانٹتے رہتے ہیں اور ان کا موازنہ دوسرے طلبہ سے کرتے ہیں۔ ایسے میں اکثر ان کے احساس کو صدمہ پہنچتا ہے جس سے ان کی شخصیت متاثر ہوتی ہے۔ والدین اس سے لاعلم رہتے ہیں اور سمجھ نہیں پاتے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کا بچہ بڑا ہو کر اپنا اور آپ کا نام روشن کرے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کا مقابلہ دوسرے بچے سے نہ کریں کیونکہ ہر بچے کی اپنی صلاحیت ہوتی ہے، اگر آپ ان کی صلاحیت سے زیادہ امید رکھیں گے تو ناامیدی ہاتھ لگے گی۔ اس لیے بچوں کے ساتھ محبت سے پیش آئیں اور ان کی ہمت بڑھائیں۔

کئی معاملوں میں دیکھا گیا ہے کہ بچہ تیز دماغ ہونے کے باوجود اسکول میں اپنے آپ کو ایڈجسٹ نہیں کر پاتا۔ ہوسکتا ہے کہ دوست اس کا مذاق اڑاتے ہوں اور اساتذہ اسے ڈانٹتے ہوں۔ چھوٹی چھوٹی باتیں بھی کئی بار طلبہ کو پڑھائی سے متنفر کر دیتی ہیں۔ بہتر یہ ہوگا کہ بچے کی تعلیمی سرگرمیوں کی

جانکاری حاصل کریں۔ دوستوں کے بارے میں پوچھیں اور نئی پریشانیوں و الجھنوں کو حل کرنا سکھائیں۔

دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ نفسیات کے پروفیسر اشوک گپتا کا کہنا ہے کہ آج تقریباً 60 سے 65 فی صد بچے پڑھائی کو لے کر تناؤ محسوس کرتے ہیں۔ اسے کم کرنے کے لیے وہ مختلف طریقے مثلاً ٹی.وی. دیکھ کر انٹرنیٹ سرفنگ کرکے یا فون پر دوستوں سے گھنٹوں باتیں کرکے تناؤ دور کرتے ہیں۔ آج تقریباً تمام والدین تعلیم ہی کو کامیابی کا ذریعہ سمجھنے لگے ہیں جس کی وجہ سے وہ بچوں کی قوت و صلاحیت کے دوسرے رخوں کو نظرانداز کرنے لگے ہیں۔ جبکہ یہ بھی انسان کی شخصیت کے ضروری پہلو ہیں جس کو زیادہ تر والدین سمجھ نہیں پاتے اور اسے نظرانداز کر دیتے ہیں۔ اگر آپ اپنے بچوں کی شخصیت مثبت خیالات سے پُر بنانا چاہتے ہیں تو پہلے اپنے آپ کو بدلنا ہوگا۔ اس کے علاوہ وقت سے پہلے اپنے بچوں کے اوپر زیادہ دباؤ نہ ڈالیں۔

دوسری طرف بچوں کے پڑھنے سے کترانے کی وجہ قدیم طریقۂ تعلیم بھی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ دلچسپ کہانیوں اور تصویروں کے ذریعے تعلیم دی جائے اور خاص طور سے یہ ساری چیزیں اسکول میں ہونی چاہئیں۔ زیادہ تر اسکولوں میں لگاتار پڑھائی کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور ہفتے میں کھیل کے بہت کم پیریڈ ہوتے ہیں جس کی وجہ سے بچے ایسے معمول سے اوبنے لگتے ہیں۔ اگر اسکول میں کلاس کے بعد دس منٹ کا وقفہ دیا جائے تو ان کی تعلیمی صلاحیت میں اضافہ ہوگا اور وہ دل لگا کر پڑھیں گے۔

(بشکریہ "ہندستان" دہلی، 5/اکتوبر 2003) □□□

## بوسکی کا پنچ تنتر (پانچ حصوں میں)

**مصنف: گلزار**

"پنچ تنتر" کو ہندستانی ادبیات میں بے حد اہم مقام حاصل ہے۔ اس کی کہانیاں دلنشیں ہونے کے ساتھ ساتھ سبق آموز بھی ہیں۔ جناب گلزار نے اس کتاب میں بچوں کی ذہنی صلاحیت کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کہانیوں کی زبان بالکل سادہ اور عام فہم رکھی ہے تاکہ بچے انھیں دلچسپی سے پڑھنے کے ساتھ ساتھ لطف اندوز بھی ہوسکیں۔

**صفحات: 120، قیمت مکمل سیٹ: -/150 روپے**

## بوسکی کے کپتان چاچا

**مصنف: گلزار**

گلزار کے قلم سے بے حد آسان اور عام فہم زبان میں
بچوں کے لیے ایک ایسی کہانی جس سے
باتوں باتوں میں کافی معلومات بھی حاصل ہوجاتی ہیں۔

**صفحات: 68، قیمت: -/55 روپے**

## تعلیمی تشکیلِ نو کے مسائل

**مصنف: خواجہ غلام السیدین**

اسکول میں ایک ایسا ماحول بنانا جس میں بچوں کی فطری صلاحیتیں آزاد فضا میں نشوونما پاکر ابھر سکیں، ان کی فطری نشوونما کے لیے بے حد ضروری ہے۔ اس کے لیے لازمی ہے کہ اساتذہ کی تربیت ایک خاص نہج پر کی جائے۔ اس کتاب میں انھی امور پر گفتگو کی گئی ہے۔

**صفحات: 307، قیمت -/96 روپے**

## خواجہ میر درد

**مصنف: ظہیر احمد صدیقی**

خواجہ میر درد اردو کے سب سے بڑے صوفی شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ حالانکہ ان کے کلام میں تصوف کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ اس کتاب میں درد کے حالاتِ زندگی، ان کی تصانیف، شاعرانہ خصوصیات کے ساتھ ساتھ تصوف پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ نوآموز طلبہ کے لیے ایک بہترین کتاب۔

**صفحات: 64، قیمت: 14 روپے**

## عربی ادب کی تاریخ (جلد اوّل)

**مصنف: ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی**

اس کتاب کے مقدمے میں مولانا ابوالحسن علی ندوی نے صاحبِ کتاب کی صلاحیتوں کی داد ان لفظوں میں دی ہے۔ "ان کے ذہن و ذوق نے اس موضوع کو صحیح طور پر ہضم کرلیا ہے اور وہ اس میں محض نقال یا خوشہ چیں نہیں ہیں بلکہ اس سے لطف لینے میں اہلِ زبان کے شریک اور اہلِ ذوق کے ہمنفس اور ہمنوا ہیں۔ ان کی تحریر میں سنجیدگی بھی ہے، شگفتگی بھی، سلاست بھی حلاوت بھی، مورخ کا احساسِ ذمہ داری بھی اور ایک صاحبِ ذوق کا انبساط و اختلاط بھی۔"

**صفحات: 352، قیمت: -/86 روپے**

## [illegible] تامل ناڈو میں عربی، فارسی [illegible] ادبیات [illegible] (جلد اول۔ عربی)

**مصنف: کاوش بدری**

جنوبی ہند میں اردو کے ساتھ ساتھ عربی اور فارسی کو بھی خاطرخواہ فروغ حاصل ہوا۔ اس کتاب میں تمل ناڈو میں عربی زبان و ادب کے فروغ کا تاریخی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ نیز وہاں کے اہم علما کا تعارف، کتب خانوں اور نادر مخطوطات کی تفصیلات، اہم عربی مدارس اور عصرِ حاضر میں عربی تعلیم پر بھی گہری نظر ڈالی گئی ہے۔

**صفحات: 176، قیمت: -/98 روپے**

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

**قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان**

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

تحریر: ایس. ایس. چوہان
مترجم: مشرف علی

# بچہ مزدوری کے مسائل (اسباب اور تدابیر)

انگریزی کا مشہور مقولہ ہے کہ "Child is the father of man" لیکن اس کے باوجود ہم بچوں کے مستقبل کے لیے کچھ خاص اقدام نہیں کرتے حالانکہ ظاہری طور پر اس سلسلے میں بہت دکھاوے کیے جاتے ہیں۔ یہ مفروضہ کہ بچہ مزدوری کی لعنت صرف غریب ملکوں میں موجود ہے محض ایک فریب ہے کیونکہ دنیا کے بچوں کی صورت حال کے متعلق UNICEF کی تازہ ترین رپورٹ کے مطابق صنعتی ممالک میں حیرت انگیز طور پر کام کرنے والے بچوں کا تناسب زیادہ ہے۔ صنعتی ممالک یہ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے بچہ مزدوری کو پوری طرح ختم کردیا ہے اور یہ نصیحت بھی کرتے ہیں کہ اس لعنت کو ختم کرنے کے سلسلے میں غریب ممالک کو ان کی پیروی کرنی چاہیے۔ حالانکہ دسمبر 1996 میں شائع ہونے والی رپورٹ کے مطابق ترقی یافتہ ممالک میں ابھی بھی بچے خطرناک قسم کے کاموں میں مزدوری کرتے ہوئے دیکھے جاسکتے ہیں۔ اس رپورٹ میں موجود قابل اعتماد تخمینہ کے مطابق برطانیہ میں 11 سال تک کی عمر کے 15 سے 26 فی صد بچے اور 15 سال کی عمر تک کے 36 سے 66 فی صد بچے محنت مزدوری کررہے ہیں۔ امریکہ میں بیش تر بچے زراعتی کاموں میں مشغول ہیں اور ان میں ایسے لوگوں کا تناسب زیادہ ہے جو مہاجر یا نسلی اقلیتی خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔[1]

معاشی عمل کے طور پر بچہ مزدوری کا آغاز ہندستان میں صنعتی انقلاب کے وقت شروع ہوا اور یہی وہ وقت تھا جب صنعتوں میں سستے مزدوروں کی مانگ تیزی سے بڑھی اور عوام الناس میں غریبی کی شدت کی وجہ سے بچہ مزدوری کے استحصال کا رجحان روزگار فراہم کرنے والوں کے یہاں شدید ترین طریقے سے پروان چڑھا اور جس کے نتیجے میں فیکٹریوں اور دیگر صنعتی اداروں میں بچوں کی ایک بہت بڑی تعداد سے مزدوری کرائی جانے لگی۔ اس سلسلے میں صحیح اور واضح ڈاٹا موجود نہیں ہے کہ کتنے بچے مختلف صنعتوں میں محنت ومزدوری کررہے ہیں تاہم اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہندستان کے صنعتی اداروں میں بچوں کی ایک قابل ذکر تعداد محنت ومزدوری میں مشغول ہے اور جس کی وجہ سے اس سلسلے میں کچھ مخصوص مسائل ابھر کر سامنے آئے ہیں۔

ملک میں محنت و مزدوری کرنے والے بچوں کی تعداد تقریباً 44 سے 100 ملین کے درمیان ہے۔ ہندستان کی سرکار کے مطابق 17.5 ملین بچے محنت ومزدوری کرتے ہیں۔[2] بہت عرصے پہلے Royal Commission نے 1931 میں یہ پتہ لگایا تھا کہ 5 برس تک کی عمر کے بچے ایک دن میں 18 گھنٹے کام کرتے ہیں۔ The Labour Investigation Committee (1946) نے اس سلسلے میں لکھا ہے:

''ہندستان میں محنت و مزدوری کی صورت حال سے متعلق ایک بدنما داغ یہ ہے کہ یہاں کچھ صنعتوں میں غیر قانونی طور پر بچے محنت ومزدوری میں مشغول ہیں۔''

ہندستان میں آزادی کے بعد بچوں کے روزگار سے متعلق کرائے جانے والے سروے کے مطابق منظم اور غیر منظم سیکٹروں میں کام کرنے والے بچوں کی حالت نہایت خراب اور غیر انسانی ہے۔ 14 برس سے کم عمر کے بچوں کو خطرناک کاموں مثلاً زیر زمین کانوں (Mines)، کھلی کانوں (Mines)، پٹاخے بنانے والے کارخانوں، چمڑے تیار کرنے والی فیکٹریوں، کیمیاوی کارخانوں، اینٹ کے بھٹوں اور تعمیری کاموں وغیرہ میں محنت و مزدوری کرتے ہوئے دیکھا جاسکتا ہے جہاں ہمیشہ ان کی زندگی اور صحت کے لیے خطرہ بنا رہتا ہے۔

## بچوں کے روزگار کے اہم مراکز

بچے ایسی تمام صنعتوں میں موجود ہیں جہاں ان کی غیر ہنرمندانہ محنت اور محدود جسمانی صحت کا استعمال کیا جاسکتا ہے۔ بچہ مزدوری کو چار اہم گروپوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ (a) زراعت (b) صنعت (c) تجارت (d) گھریلو اور نجی کام۔ یہ کہا جاتا ہے کہ سب سے زیادہ کام کرنے والے بچوں کی تعداد زراعت میں مشغول ہے۔ پہلے اور دوسرے Agriculture Labour Inquiries کے مطابق 15 برس سے کم عمر کے مزدور بچوں کا فیصد کل مزدوروں کے مقابلے میں بالترتیب 4.8% اور 7.7% تھا۔ زراعت کے علاوہ بچوں کے کام کرنے کے اہم مراکز صنعتی کارخانے میں جہاں 15 برس سے کم عمر کے بچہ مزدور بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ صنعتی سیکٹر میں بچوں سے سب سے زیادہ کام پٹاخہ بنانے والے کارخانوں، چمڑا تیار

کرنے والی فیکٹریوں، قالین بنانے والے کارخانوں اور اینٹ کے بھٹوں میں لیا جاتا ہے۔ جب کہ تجارت، گھریلو اور نجی کاموں میں مشغول بچہ مزدوری کا تناسب موجود نہیں ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ بچے بہت زیادہ محنت و مزدوری کرتے ہیں جس کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں ہے۔

بچہ مزدوروں کی بدترین حالت غیر منظم صنعتی اداروں اور کارخانوں میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ جہاں بچوں کی ایک بڑی تعداد مزدوری میں مشغول ہے۔ یہ فیکٹریاں اور کارخانے فیکٹری ایکٹ کے تحت نہیں آتے اور ان کے لیے کوئی مخصوص قانون شاذ و نادر ہی موجود ہیں مثال کے طور پر ریاست مدھیہ پردیش اور مدراس میں۔ اس طرح کے کارخانوں میں بیڑی بنانے، چپڑا لاکھ بنانے، قالین بنانے، ماچس بنانے، شیشے کی چوڑیاں بنانے، کھلونا بنانے وغیرہ کا کام ہوتا ہے۔ ایسے صنعتی اداروں میں کام کرنے کا ماحول ناقابلِ بیان حد تک غیر انسانی اور صحت کے لیے مضر ہے۔ ایسے مقامات پر بھی جہاں بچہ مزدوری کے خلاف قانون موجود ہے وہاں بھی کبھی کبھار ایسا لگتا ہے کہ ایسے قانون کی بہت حد تک خلاف ورزی کی جاتی ہے اور یہاں 6 سے 12 برس کی عمر کے بچوں کی ایک بڑی تعداد کو مختلف مقامات پر کام کرتے ہوئے دیکھا جاسکتا ہے۔ پورے ملک کے شہری علاقوں میں 12 برس سے کم عمر کے بچے ہوٹلوں، ریستورانوں اور ڈھابوں پر کام کرتے ہوئے آسانی سے دیکھے جاسکتے ہیں۔ ایسے بچوں کے لیے کام کرنے کا کوئی متعین وقت مقرر نہیں ہے اور نہ ہی ان کے آرام کرنے کا کوئی وقفہ متعین ہے۔ ایسے بچہ مزدوروں کی نہ تو کوئی متعین اجرت ہوتی ہے اور نہ ہی اس کی ادائیگی کی کوئی ضمانت۔ ایسے بچے نہایت غیر انسانی اور آلودہ ماحول میں رہتے ہیں۔ یہاں بنیادی حقوق (دفعات 24-23) اور رہنما اصول Directive Principles (Art 39F) کا سوال سامنے آتا ہے کہ آزاد ہندستان کے ایسے بچے استحصال سے کس حد تک محفوظ ہیں؟

## بچہ مزدوری کے اسباب

دنیا کے مختلف حصوں میں بشمول ہندستان، صنعت کاری کے آغاز نے بچہ مزدوری کو جنم دیا۔ لیکن ہندستان کے سیاق میں مندرجۂ ذیل اسباب بچہ مزدوری کے لیے ذمّے دار ہیں:

(1) بالغ مزدوروں کی قلیل آمدنی

(2) زیادہ آبادی اور غریبی

(3) ریاستی کنٹرول کی عدم موجودگی

(4) قوانین کے نفاذ میں کوتاہی

(5) ذات پات کا نظام

تمل ناڈو کے تین بڑے شہروں میں کرائے گئے حالیہ سروے سے اس بات کا انکشاف ہوا ہے کہ 55% بچے جو محنت مزدوری کرتے ہیں ان کا تعلق ایسے خاندانوں سے ہے جن کی ماہانہ آمدنی 300 روپے سے کم ہے اور بچوں کی کل تعداد میں 72% بچے روزگار اس لیے تلاش کرتے ہیں تاکہ وہ اپنے خاندان کی آمدنی میں اضافہ کرسکیں۔ مزید یہ کہ ریاستی حکومتیں بھی اس خراب صورتِ حال کے لیے ذمّے دار ہیں کیونکہ یہ ریاستیں بچوں کے تحفظ کے لیے پُر اثر قانون نافذ کرنے میں ناکام رہی ہیں۔ ہندستان میں دیگر چیزوں کے ساتھ ذات پات کے نظام کے سخت رویّے نے ملک میں بچہ مزدوری کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ UNICEF کی ایک رپورٹ کے مطابق: ''ہندستان میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ کچھ لوگ حکومت کرنے اور دماغی کام کرنے کے لیے پیدا ہوتے ہیں جب کہ دوسرے لوگ یعنی عوام کی بڑی آبادی جسمانی محنت اور کام کرنے کے لیے پیدا ہوئی ہے۔''[4]

مختلف بین الاقوامی سیمناروں میں 1996 کے دوران بچہ مزدوری کے مسائل پر سنجیدگی سے غور و خوض کیا گیا اور ترقی یافتہ ملکوں نے جہاں اس صورتِ حال کے لیے ترقی پذیر ممالک کو ذمّے دار ٹھہرایا وہیں ترقی پذیر ممالک نے بچوں کے مزدوری کرنے پر مکمل پابندی عائد کرنے میں لاچاری ظاہر کی کیونکہ یہ بچے اپنے خاندان کی آمدنی کو بڑھانے میں کافی حد تک معاونت کرتے ہیں۔ ایسے ممالک کے غریب عوام کو اگر آمدنی کے دیگر ذرائع اور مدد فراہم کی جائے تو اس مسئلے پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ اس مقصد کے لیے ان ملکوں نے ترقی یافتہ دولت مند صنعتی ممالک سے مالی تعاون کا مطالبہ کیا جو ایسے صنعتی اداروں میں تیار ہونے والے مختلف سامان کی درآمد پر پابندیاں عائد کررہے ہیں جہاں بچے محنت و مزدوری کرتے ہیں۔ یہ مطالبہ ترقی یافتہ اور دولت مند ممالک کو قبول نہیں تھا لہٰذا دنیا کے مختلف ملکوں میں بچہ مزدوری کو ختم کرنے کے لیے منعقد ہونے والے بحث و مباحثے میں کوئی ٹھوس اقدام نہیں اٹھائے جاسکے۔

## بچہ مزدوری کو ختم کرنے کے لیے قانونی کوششیں

آزادی کے بعد ہندستان کی سرکار اور مختلف ریاستی سرکاروں نے اس مسئلے کے خاتمے کے لیے مختلف قسم کے قانون پاس کیے ہیں۔ ان کا مختصر خاکہ یوں ہے:

**(1) فیکٹریز ایکٹ 1948—(Factories Act 1948):**

فیکٹری ایکٹ، 1948، کے مطابق کوئی بھی شخص جس کی عمر 14 برس سے کم ہو وہ بچہ ہے۔ اس ایکٹ کے تحت ملک میں بچوں سے مزدوری کرانے پر پابندی عائد ہے۔ 14 برس سے کم عمر کے کسی بھی بچے سے کسی فیکٹری یا

انڈسٹری میں کام نہیں کرایا جاسکتا ہے۔ 14 برس سے زیادہ عمر کے بچوں کے لیے کام کا وقفہ ساڑھے چار گھنٹے متعین کیا گیا ہے اور بچوں کے لیے رات میں اور خطرناک پیشوں میں کام کرنے کی ممانعت ہے۔

**(2) معدنی ایکٹ، 1952 (Mines Act, 195):**

کانوں میں کام کرنے کی کم سے کم عمر 15 برس متعین ہے۔ اس ایکٹ کے تحت 15 برس سے کم عمر کے بچوں کے لیے کان کے کسی بھی حصے میں مزدوری کرنے کی ممانعت ہے۔ اس ایکٹ کے مطابق نوعمر بچوں سے ایک دن میں ساڑھے چار گھنٹے سے زیادہ مزدوری نہیں کرائی جاسکتی ہے۔

**(3) بچہ مزدوری کی ضمانت ایکٹ 1933**

**(Children (Pledging of Labour) Act, 1933):**

یہ ایکٹ مزدوری سے متعلق Royal Commission کی سفارشات کے نتیجے میں پاس ہوا تھا۔ اس ایکٹ کو اس مقصد کے تحت عمل میں لایا گیا تھا تاکہ بچوں کے والدین یا سرپرست وغیرہ کے ذریعے بچوں سے مزدوری کرائے جانے سے متعلق اقرارنامے پر روک لگائی جاسکے اور اس طرح کے اقرارنامے کو کالعدم قرار دیا جاسکے۔ اس ایکٹ کے مقصد کے تحت 15 برس سے کم عمر کے شخص کو بچہ سمجھا جاتا ہے۔ اس قانون کی خلاف ورزی کرنے پر 200 روپے تک جرمانہ مزدوری فراہم کرنے والے پر اور 50 روپے جرمانہ والدین پر عائد ہوتا ہے۔

**(4) بچہ روزگار ایکٹ 1938**

**Employment of Children Act, 1938:**

اس ایکٹ کو اس لیے پاس کیا گیا تاکہ ایسے کارخانے جو فیکٹری ایکٹ کے دائرے سے باہر ہیں وہاں کام کرنے والے بچوں کے غلط استعمال کو روکا جاسکے۔ اس ایکٹ کے تحت 15 برس سے کم عمر کے بچے مزدوری نہیں کرسکتے۔ 15 سے 17 برس کے درمیان کے کسی بھی بچے سے اس وقت تک مزدوری نہیں کرائی جاسکتی جب تک کہ ایک دن میں اسے لگاتار 12 گھنٹے آرام کرنے کی مہلت نہ ملے۔ اس ایکٹ کے تحت یہ بھی ضروری ہے کہ نوکری دینے والے ایک رجسٹر تیار کریں جس میں 17 برس سے کم عمر کے بچہ مزدوروں کے نام، تاریخ پیدائش وغیرہ کا اندراج ہو۔ کچھ مخصوص پیشوں میں بچوں کے لیے رات میں کام کرنے کی سخت ممانعت ہے۔

**(5) بچہ مزدوری، ممانعت اور روک تھام، ایکٹ 1986**

**(Child Labour (Prohibition & Control) Act, 1986):**

اس ایکٹ کے تحت بچوں کے کام کرنے کے اوقات کا تعین کیا گیا ہے۔ اس ایکٹ کے تحت بچوں سے رات میں مزدوری کرانا اور اوور ٹائم کرانا منع ہے اور اس قانون کی خلاف ورزی کرنے والے کے لیے سخت سزا کا انتظام ہے۔

ایک طرف اگر منظم سیکٹر میں بچہ مزدوری کے نظم و نسق اور ان کی حفاظت کے لیے قوانین موجود ہیں تو وہیں دوسری طرف غیر منظم سیکٹر میں بچہ مزدوری کے لیے کوئی قاعدہ قانون نہیں ہے۔ زراعت اور گھریلو کاموں میں مشغول بچوں کے لیے کوئی قانون نہیں ہے۔ ایک مناسب قانون پاس کرنے کی ضرورت ہے تاکہ غیر منظم سیکٹر میں کام کرنے والے بچوں کے مفادات کی حفاظت ہوسکے۔

## دیگر کوششیں

ہندستان میں کام کرنے والے بچوں کی تعداد سب سے زیادہ یعنی 17.2 ملین ہے۔ محنت و مزدوری کرنے والوں میں بچوں کا تناسب سات فیصد ہے جبکہ GDP میں ان کا حصہ 20 فی صد ہے۔ 90 فی صد سے زیادہ بچہ مزدور صرف 11 ریاستوں میں موجود ہیں۔

سرکار کا نشانہ یہ ہے کہ دو ملین بچوں کے لیے ہر سال آبادکاری کی مہم پانچ سال تک چلائی جائے۔ اس مقصد کے تحت سرکار نے پانچ برسوں کے لیے 8,500 ملین روپے مختص کیے ہیں اور ہر سال ایک بچے پر 4,300 روپے خرچ کیے جائیں گے یعنی ہر مہینے لگ بھگ 358 روپے۔ حالانکہ یہ ناکافی رقم ہے تاہم ان بچوں کے معیار زندگی کو بہتر بنانے کے لیے ایک شروعات ہوچکی ہے۔ لوگوں کے سماجی اور معاشی حالات میں عام طور سے بہتری آنے سے یہ امید کی جانی چاہیے کہ ہمارے کارخانوں سے دھیرے دھیرے بچہ مزدوری کا خاتمہ ہوجائے گا۔

ہندستان کی سرکار نے 63 ضلعوں میں چائلڈ لیبر پروجیکٹ کو منظوری دی ہے جبکہ National Child Labour Project (NCLP) کی اسکیم کے تحت پہلے سے اس طرح کے 12 پروجیکٹ جاری ہیں۔ یہ اسکیم 140 ہزار بچوں کے لیے ہے۔ 123 ضلعوں میں بچہ مزدوری پر تفصیلی سروے کرنے اور ان موجودہ خطروں کے پیش نظر درجہ بندی کرنے کے لیے 2.46 کروڑ روپے جاری کیے گئے ہیں۔

NCLP اسکیم کے تحت ایسے مخصوص اسکولوں کا قیام شامل ہے جہاں کارخانوں سے نکال کر لائے گئے بچوں کو تعلیمی اور پیشہ ورانہ تربیت مہیا کرائی جاسکے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ انھیں مراعات کے طور پر ماہانہ وظیفہ اور دوپہر کے کھانے کے ساتھ ان کی صحت کی دیکھ بھال کی جاسکے۔

## بیداری مہم

چند برسوں قبل پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا (ٹی.وی. ریڈیو وغیرہ) کے ذریعے قومی سطح پر بڑے پیمانے پر بیداری مہم کا آغاز ہوا ہے تاکہ عوام کو بچہ مزدوری کے خلاف حساس بنایا جاسکے۔ مزید یہ کہ ہندستان کی سرکار نے بھی سب سے زیادہ بچہ مزدوری والے 13 ضلعوں میں ضلعی سطح پر بیداری مہم کے لیے 6.65 کروڑ روپے جاری کیے ہیں۔ اسی طرح کی بیداری مہم کا آغاز اگر ریاستی حکومتوں کے ذریعے پورے ملک میں کیا جائے تو اس کی مدد سے بچہ مزدوری کی لعنت کو ہم اپنی سرزمین سے ختم کرسکتے ہیں۔

## سفارشات

بچہ مزدوری کے مسئلے کے تفصیلی تجزیے کے بعد مقالہ نگار نے کچھ مخصوص نتائج اخذ کیے ہیں۔ یہ ایک ایسی لعنت ہے جو ہمارے ملک کے چہرے پر ایک بدنما داغ ہے اور اسے ختم کرنے کے لیے یہاں کچھ مشورہ دینا سودمند ہوگا۔ یہ مشورے/سفارشات مندرجۂ ذیل ہیں:

(1) بچہ مزدوری سے متعلق قانون کا نفاذ سختی سے کیا جانا چاہیے اور اس قانون میں موجود سزا کو مزید سخت کیا جانا چاہیے تاکہ اس کی خلاف ورزی کرنے والے دوبارہ اس قانون کو توڑنے کی جرأت نہ کرسکیں۔

(2) مرکزی اور ریاستی حکومتوں کو الگ سے ایک قانون پاس کرنا چاہیے تاکہ زراعتی اور گھریلو سیکٹروں یعنی غیر منظم سیکٹروں میں کام کرنے والے بچہ مزدوروں کی حفاظت ہوسکے۔

(3) گاؤں کی پنچایتوں اور مہیلا منڈلیوں کو ذمے داری سونپی جانی چاہیے کہ وہ بچہ مزدوری کے عمل کو ملک سے ختم کرنے میں اپنا کردار ادا کریں۔

(4) غریبوں کے بچوں کے لیے مفت اور لازمی تعلیم کا انتظام کیا جانا چاہیے۔ ایسے غریب خاندانوں کو جو اپنے بچوں کو اسکول بھیجتے ہیں انھیں اس مقصد کے لیے مراعات کے طور پر وظیفہ، دوپہر کا کھانا اور امدادی راشن فراہم کیا جانا چاہیے۔

(5) National Child Labour Project کی توسیع ملک گیر سطح پر تمام ضلعوں میں کی جانی چاہیے۔

(6) مرکزی، ریاستی اور مقامی سطح پر سمعی اور بصری ذرائع ابلاغ کے ذریعے ایک زبردست بیداری مہم کا آغاز کیا جانا چاہیے۔ اس سلسلے میں زیادہ توجہ ٹیلی ویژن پر مرکوز کی جانی چاہیے کیونکہ ٹیلی ویژن اب ملک کے گوشے گوشے میں دستیاب ہے۔ اس سلسلے میں غیر سرکاری اداروں کی امداد بھی لی جانی چاہیے۔

(7) ترقی یافتہ ملکوں کو ایسے ممالک سے سامان کی درآمد پر سخت پابندی عائد کرنی چاہیے جہاں بچہ مزدوری کا عمل جاری ہے۔ اس مقصد کے لیے یہ ضروری ہے کہ ترقی یافتہ ممالک ایسے ملکوں کی مالی امداد کریں جہاں غریبی کی وجہ سے بچے بہت کم عمر میں مزدوری کرنے کے لیے مجبور ہوتے ہیں۔

(8) غریبی کی وجہ سے جہاں بچہ مزدوری کا فوری خاتمہ ممکن نہیں ہے وہاں سرکار اور مزدوری دینے والوں کو مشترکہ طور پر پارٹ ٹائم تعلیم اور پیشہ ورانہ تربیت کے لیے انتظام کرنا چاہیے۔ بچوں کو صرف خطروں سے عاری پیشوں میں کام کرنے کی اجازت دی جانی چاہیے۔

(9) ذات پات کی بنیاد پر موجود بچہ مزدوری کے عمل سے سختی سے نپٹنا چاہیے اور اسے جرم قابلِ سماعت عدالت بنا دینا چاہیے۔

اگر ہم واقعی اس مسئلے سے تعلق رکھتے ہیں تو ہمیں اسے محض سرکار کی ذمے داری نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ سماج، والدین اور غیر سرکاری اداروں کو اس سلسلے میں قابلِ ذکر کردار ادا کرنا چاہیے تاکہ ہم اپنی سرزمین سے اس لعنت کو ختم کرسکیں۔ بچے جو ہمارے مستقبل کی نسل اور طاقت ہیں اور ان سب سے بڑھ کر ایک آزاد جمہوری ملک کے شہری ہیں، ان کے ساتھ اس قسم کا برا سلوک نہیں کیا جانا چاہیے۔

References


1. Tribune - 26 sep. 1996, p.15
2. US Govt. Report on child worker. Tribune, 24 sep. 1994, p.8
3. Bhagoliwal, T.N. Economics of Labour and Industrial relation. Sahitya Bhawan, Agra, 1995, p. 654
4. UNICEF Report. child labour : Caste system a factor, tribune, Jan 1997, p.8
5. Eliminating child labour. Yojna, Govt. of India, Ministry of Planning May 1996, p. 29


(بشکریہ "تھرڈ کنسیپٹ" نئی دہلی، دسمبر 2003)

□□□

بھرت جھن جھن والا

# انٹرنیٹ پر کنٹرول کے لیے سرکاری پیش رفت کی ضرورت

آنے والے دنوں میں انٹرنیٹ کی اہمیت اتنی ہی ہوگی جتنی ٹیلی فون یا ریڈیو کی آج ہے۔ اگر ملک کا ٹیلی فون نظام ٹھپ ہوجائے تو کتنی پریشانی ہوگی اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ٹیلی فون نجی کمپنیاں فراہم کرارہی ہیں تو بھی کنٹرول سرکار کا ہی ہوتا ہے کیونکہ ملک کے قانون اور اقتصادی نظام کا اس پر انحصار ہے۔ تقریباً یہی صورت حال انٹرنیٹ کی ہے۔ اطلاعات کی ترسیل کا یہ اہم وسیلہ بن گیا ہے لہٰذا انٹرنیٹ پر اسی طرح کا کنٹرول ضروری ہے۔

فی الحال انٹرنیٹ پر امریکی سرکار کا کنٹرول ہے۔ انٹرنیٹ کی ایجاد امریکہ میں امریکی سرکار کی مالی امداد سے ہوئی تھی۔ ابتدا میں انٹرنیٹ کی رسائی صرف امریکہ تک محدود تھی۔ اس لیے امریکی سرکار نے اس کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں لیا تھا۔ 1998 میں امریکی سرکار کی وزارت کامرس نے انٹرنیٹ پر نام الاٹ کرنے کے لیے 'اکان' نام سے ایک کمپنی قائم کی، جس طرح ہر ٹیلی فون کا خاص نمبر ہوتا ہے اسی طرح ہر انٹرنیٹ کھاتے دار کا ایک مخصوص نام ہوتا ہے جسے ای میل آئی. ڈی. کہتے ہیں۔ دو ٹیلی فون کو اگر ایک ہی نمبر الاٹ کردیا جائے تو ٹیلی فون ایکس چینج کو پتہ نہیں لگے گا کہ کس فون سے لائن کو جوڑیں۔ اسی طرح کسی اطلاع کو انٹرنیٹ کے ذریعے اسی وقت بھیجا جاسکتا ہے جب اس شخص کے کھاتے کا نام رجسٹرڈ ہو۔ پوری دنیا کے ای میل آئی. ڈی. کا رجسٹریشن 'اکان' کرتی ہے۔ آپ کو کسی شخص سے رابطہ قائم کرنا ہے، آپ کے پاس اس کا نام ہے اور ڈرائیونگ لائسنس کا نمبر ہے، لیکن اس کا پتہ نہیں ہے۔ آپ پہلے روڈ ٹرانسپورٹ آفس سے رابطہ کریں گے اور وہاں سے لائسنسی کا پتہ لگائیں گے، اسی صورت میں آپ اسے خط بھیج سکتے ہیں۔ ڈرائیونگ لائسنس کے ضمن میں جو کام آر. ٹی. او. کرتا ہے وہی کام انٹرنیٹ کے ضمن میں 'اکان' کرتی ہے۔ جب آپ کسی ای میل آئی. ڈی. پر اطلاع بھیجتے ہیں تو انٹرنیٹ کا سرور (Server) 'اکان' سے معلوم کرتا ہے کہ اس اطلاع کو کہاں بھیجا جائے، 'اکان' بتاتی ہے کہ اس آئی ڈی کو فلاں سرور پر بھیج دیا جائے وہ اطلاع وصول کرنے والے کے سرور میں آجاتی ہے۔ وصول کنندہ کمپیوٹر کی مدد سے اپنے کھاتے کو کھول کر وہ اطلاع حاصل کرلیتا ہے۔ اگر آر. ٹی. او. کا دفتر بند ہے تو اس شخص سے رابطہ قائم کرنا ناممکن ہوجائے گا۔ اگر 'اکان' کمپنی کام نہ کرے یا آپ کے ای میل آئی. ڈی. کا پتہ دوسرے سرور کو نہ بتائے تو آپ کوئی بھی اطلاع حاصل نہیں کرسکیں گے۔ وقت کے ساتھ ساتھ انٹرنیٹ کا استعمال پوری دنیا میں ہونے لگا ہے، لیکن اس نظام کا کنٹرول آج بھی اسی امریکی کمپنی کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ کمپنی امریکی سرکار کے اشاروں پر کام کرتی ہے۔ مثلاً 'اکان' نے یک طرفہ اعلان کردیا کہ اس کے 18 ڈائرکٹروں میں سے صرف 5 کا ہی انتخاب ہوگا اور جن 4 ڈائرکٹروں نے اس کمپنی کو شروع کیا وہ ڈائرکٹر بنے رہیں گے۔ عام کمپنی ڈائرکٹروں کی جواب دہی شیئر ہولڈروں کے تئیں ہوتی ہے۔ لیکن 'اکان' میں کوئی شیئر ہولڈر نہیں ہے۔ اس کی جواب دہی صرف امریکہ کی وزارت کامرس کے تئیں ہے۔ اگر 'اکان' کے ڈائرکٹر کوئی غلطی کرتے ہیں تو انٹرنیٹ کے صارفین کے پاس امریکی سرکار یا امریکہ کی عدالت کے سامنے فریاد لے جانے کے علاوہ دوسرا کوئی راستہ نہیں رہ جاتا۔ انٹرنیٹ کا کنٹرول تقریباً پوری طرح امریکی سرکار کے ہاتھوں میں ہے۔ امریکی سرکار چاہے تو نشاندہی کیے گئے افراد کے ای میل آئی ڈی کو بلاک کرسکتی ہے اور انھیں انٹرنیٹ کی سہولت سے محروم کرسکتی ہے یا نشاندہی کی گئی ویب سائٹ کو بلاک کرسکتی ہے، جس سے وہ اطلاع کوئی دوسرا حاصل ہی نہ کرسکے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ انٹرنیٹ پر آنے جانے والی خبروں پر امریکی سرکار نگرانی رکھے۔ جس طرح جنگ وغیرہ کے دوران خفیہ ایجنسیاں ڈاک خانے میں خطوط کو کھول کر دیکھتی ہیں اسی طرح امریکہ انٹرنیٹ پر ہورہی بات چیت کو سن سکتا ہے۔

امریکہ کا کہنا ہے کہ وہ انٹرنیٹ کو کسی کثیر قومی ادارے کو نہیں سونپنا چاہتا، چونکہ چین جیسے ممالک کا ریکارڈ اطلاعات کی کھلی ترسیل کی مخالفت میں رہا ہے۔ یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ ابھی تک امریکہ نے انٹرنیٹ کے استعمال پر کوئی روک نہیں لگائی ہے، جب کہ چین جیسے ممالک کی سرکاریں خصوصی ویب سائٹوں کو وقتاً فوقتاً بلاک کرتی رہتی ہیں۔ ابھی تک امریکہ کا ریکارڈ چین سے بہتر ہے۔ پھر بھی اس بنیاد پر انٹرنیٹ پر امریکی کنٹرول کو تسلیم نہیں کیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا ہر ملک کے عوام کو اپنے سیاسی نظام کی ذمے داری خود لینی ہی پڑے گی۔ چونکہ آنے والے وقت میں اس میں پریشانیاں آسکتی ہیں۔ انٹرنیٹ پر امریکہ کے اس کنٹرول کو چین، جنوبی افریقہ، ہندستان اور برازیل نے چنوتی دی ہے۔ اقوام متحدہ کے تحت عالمی فاصلاتی مواصلات یونین کی تشکیل ہوئی تھی۔ یہ ادارہ اس وقت ٹیلی فون، ٹیلی گرام، ریڈیو، ٹیلی ویژن وغیرہ کا نظام سنبھالتا ہے۔ ان ممالک کا مطالبہ ہے کہ انٹرنیٹ کی ذمے داری بھی اس ادارے کو سونپ دی جائے لیکن امریکہ کو موجودہ صورت حال پسند ہے، حالانکہ امریکہ اس مطالبے کی کھل کر مخالفت نہیں کررہا ہے۔

دوسرے ممالک موجودہ نظام سے فکر مند ہیں۔ جنوبی افریقہ کے صدر تھابو میکی نے گزشتہ ماہ کہا کہ 'اکان' کے رول پر غور وخوض ہونا چاہیے ورنہ دنیا کا کنٹرول کیلی فورنیا کے قانون سے ہوتا رہے گا۔ 'اکان' کا صدر دفتر کیلی فورنیا میں ہے۔ اسی طرز پر چین نے چند سال پہلے دھمکی دی تھی کہ اگر انٹرنیٹ پر چینی زبان کا استعمال شروع کیا گیا تو وہ اپنا آزادانہ انٹرنیٹ نظام قائم کرلے گا۔

ہمیں اس موضوع پر فوراً سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے، ابھی انٹرنیٹ مستحکم نہیں ہوا ہے۔ اس میں تیزی سے تبدیلی آرہی ہے۔ ہماری سرکار کو فوراً انٹرنیٹ کے فروغ اور کنٹرول پر غور کرنا چاہیے۔ طاقت مانگی نہیں جاتی لی جاتی ہے۔ اسی اصول کے تحت ہمیں متوازی انٹرنیٹ نظام قائم کرنے پر بھی غور کرنا چاہیے۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ انٹرنیٹ پر امریکہ کا تسلط اس لیے قائم ہوا ہے کہ امریکی سرکار نے انٹرنیٹ کی ترقی کے لیے مالی امداد مہیا کرائی تھی۔ اگر ہندستان کو انٹرنیٹ کے شعبے میں اپنا سکہ جمانا ہے تو ہماری حکومت کو آئندہ نسل کے انٹرنیٹ کی ترقی کے لیے ایک بڑا منصوبہ اپنے ہاتھ میں لینا ہوگا۔

732, Modern Society, Sector-15, Rohini,
P.B.10754, Delhi-85

□□□

حکیم اشہر قدیر

# پولیو کے خلاف آواز جہاں تک پہنچے

زندگی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا، اگر اس مشہور مصرعے کی حقیقت کو دیکھنا ہو تو آپ کسی ایسے انسان میں دیکھ سکتے ہیں جو بچپن سے ہی پولیو جیسی نامراد بیماری کا شکار ہو کر زندگی کی اکثر خوشگواریوں سے محروم ہو جاتا ہے۔ یہ وہ بیماری ہے جس میں متاثرہ انسان کی زندگی کو تو کوئی خطرہ نہیں ہوتا لیکن اُس کی زندگی، زندگی بھی نہیں رہتی۔

آج دنیا میں پائے جانے والے معذوروں کی کل تعداد میں پولیو سے متاثر مریضوں کی تعداد کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ معذوروں کی فہرست میں نابینا لوگوں کے بعد پولیو زدہ افراد کا ہی نمبر ہے۔ پولیو کی اس خوفناک صورتِ حال کے پیشِ نظر ہی عالمی ادارۂ صحت (WHO) نے 1980 میں پولیو کے خلاف جنگ کا اعلان کیا اور اس کو جڑ سے مٹانے کا اعادہ کیا۔ کیونکہ میڈیکل سائنس اس بیماری کے سبب مادّی (Polio Virus) پر کمند ڈالنے میں کامیاب ہوگئی اور اس وائرس کے خلاف مدافعت پیدا کرنے والی ویکسن، جس کو عرفِ عام میں پولیو ڈراپ کہتے ہیں، کی ایجاد اور استعمال سے پولیو کے نئے مریض سامنے آنا بند ہوگئے۔ اس لیے رفتہ رفتہ بیماری دنیا کے نقشے سے غائب ہونے لگی۔

آج کی تاریخ میں دنیا کے صرف 7 ممالک میں یہ نامراد بیماری پائی جاتی ہے اور بدقسمتی سے ان ممالک میں ہمارا وطنِ عزیز، ہندستان سرِ فہرست ہے۔ یوں تو ہندستان میں بھی پولیو کے خلاف جنگ 1980 سے ہی جاری ہے لیکن جب 1998 تک یہ بات واضح ہوگئی کہ عام اقدام کے ذریعے ہندستان سے یہ بیماری جانے والی نہیں ہے تو پھر عالمی ادارۂ صحت کے ساتھ ساتھ یونیسیف (UNICEF) اور دیگر بین الاقوامی و قومی فلاحی تنظیموں نے اس جانب کمربستگی کے ساتھ کام کیا اور حکومتِ ہند کی معاونت سے ہندستان میں پلس پولیو پروگرام کا آغاز ہوا جس کے تحت ایک معینہ مدت کے وقفے سے مخصوص تاریخوں میں ایک ساتھ ملک کے تمام پانچ سال سے چھوٹے بچوں کو پولیو ڈراپ پلانے کا اہتمام کیا گیا۔ جوں جوں یہ پروگرام پروان چڑھا ہندستان میں پولیو سے متاثر بچوں میں بھی کمی آنے لگی اور 2001 تک ہندستان میں پولیو کے مریضوں کا گراف کافی گر گیا۔ لیکن 2002 میں اچانک ہندستان میں پولیو سے متاثر بچوں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا۔ پولیو کے دوبارہ سر اٹھانے سے حکومتِ ہند کے ساتھ ساتھ اس مہم سے وابستہ دیگر تنظیموں کو بھی خاصی مایوسی ہوئی۔ لیکن پھر ان تمام تنظیموں نے متحد ہو کر انتہائی سنجیدگی اور فکر کے ساتھ اُن اسباب کی چھان بین کی جن میں پولیو کی بقا کا راز پنہاں تھا۔ تحقیقات کے بعد جب ریاستی اور علاقائی سطح پر پولیو کے مریضوں کی نشاندہی کی گئی تو معلوم ہوا کہ دہلی، بہار، اتر پردیش، مغربی بنگال، تامل ناڈو اور کرناٹک میں پولیو کے مریض زیادہ ہیں اور ان کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ سب سے زیادہ تشویش ناک حالت مغربی اتر پردیش کی ہے جہاں پورے ہندستان میں پائے جانے والے پولیو کے مریضوں کی نصف سے زیادہ تعداد موجود ہے۔ یہی نہیں، اس تحقیق سے ایک اور تکلیف دہ اور فکر انگیز حقیقت کا انکشاف بھی ہوا۔ وہ یہ کہ مغربی اتر پردیش میں پولیو سے متاثر بچوں میں 74 فی صد بچے مسلمان ہیں۔ اس خبر نے ملّتِ اسلامیہ کے خیر خواہوں، مسلم دانشوروں اور سماجی کارکنوں میں کھلبلی مچا دی۔ کہ آخر کیا وجہ ہے کہ پولیو مخالف مہم میں رخنہ اندازی کا داغ بھی مسلم قوم کے دامن پر آ رہا ہے۔ چنانچہ ایک پلس پولیو میں شامل تنظیمیں اپنا کام یکسوئی اور ایمانداری سے کر رہی تھیں تو دوسری طرف مسلم دانشوروں نے اس سنگین مسئلے پر غور و خوض کرنا شروع کیا۔ مسلم تعلیمی اداروں جیسے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی اور جامعہ ہمدرد نئی دہلی نے اس جانب خاص طور سے توجہ کی۔ ان اداروں سے وابستہ اساتذہ اور طلبہ نے مغربی اتر پردیش کے پولیو سے متاثرہ علاقوں جیسے غازی آباد، مرادنگر، میرٹھ، خورجہ، سکندرآباد، بلند شہر، سنبھاؤلی، ہاپڑ، لونی اور بدایوں وغیرہ کے سروے کیے اور وہاں کے مسلمانوں سے اس مسئلے پر تبادلۂ خیال کیا۔ سروے سے پتہ چلا کہ ان علاقوں میں پولیو ڈراپ سے متعلق مختلف افواہوں کا بازار گرم ہے۔ وہاں کے مقامی اخباروں نے غیر ذمے داری کا ثبوت دیتے ہوئے اس افواہ کو عام کیا کہ پولیو ڈراپ کے بہانے مسلم بچوں کو ایسی دوا پلائی جا رہی ہے جس میں نسل کشی کی استعداد موجود ہے۔ یہ خبر مسلم علاقوں میں جنگل کی آگ بن کر پھیلی۔ مسلم قوم میں پائی جانے والی تعلیم کی کمی اور پسماندگی نے آگ پر گھی کا کام کیا اور معصوم عوام کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی کہ پولیو ڈراپ کی آڑ میں مسلم قوم کو نقصان پہنچانے کی سازش جاری ہے۔ بس پھر کیا تھا ہر جگہ پولیو ڈراپ کے خلاف عوام میں غصہ پیدا ہو گیا اور احتجاج ہونے لگا۔ جب کارکنان پولیو کی دوا پلانے کے لیے مسلم علاقوں میں جاتے تو لوگ ان پر اپنے دروازے بند کر دیتے۔ اپنے بچوں کو چھپا دیتے۔ ظاہر ہے یہی صورت حال پولیو کی بیماری کے عود کر آنے اور مسلم بچوں کے زیادہ ملوث ہونے کا خاص سبب بنی۔

چنانچہ اس بے بنیاد افواہ کو جلد از جلد دور کرنا ضروری تھا۔ جس کے لیے مذکورہ تینوں مسلم تعلیمی ادارے سامنے آئے اور اپنے اپنے طور پر ہر اس افواہ کی بیخ کنی کے انتظامات کیے۔ جامعہ ہمدرد نے باقاعدہ ایک پروجیکٹ کے تحت کام کرنا شروع کیا اور جامعہ ہمدرد کے شعبۂ حفظانِ صحت کے اساتذہ بالخصوص حکیم مشکور احمد اور ڈاکٹر محمد اکرم نے اس کی کمان سنبھالی۔ ان کی قیادت میں جامعہ کے طلبہ و طالبات متاثرہ علاقوں میں گھر گھر گئے اور عوام کو یہ بتانے کی کوشش کی کہ پولیو ڈراپ سے متعلق جو غلط فہمی ہے دراصل وہ محض ایک افواہ پر مبنی ہے۔ لیکن یہ غلط فہمی لوگوں کے اذہان میں اس حد تک سرایت کر گئی تھی کہ انھوں نے رضا کاروں سے یہاں تک کہہ دیا کہ پولیو ڈراپ پلانا شریعت کی رو سے ناجائز ہے۔ اس صورتِ حال کے سدّ باب کے لیے ضروری تھا کہ اس مہم میں علمائے دین، مفتیان اور ائمہ وغیرہ کو بھی شامل کیا جائے، تا کہ شریعت کی روشنی میں وہ مسلمانوں کو اس بات پر راضی کریں کہ پولیو کی دوا پلانا نہ صرف جائز ہے بلکہ یہ ان کا دینی اور قومی فریضہ بھی ہے۔ چنانچہ جامعہ ہمدرد میں امیر جامعہ جناب سید حامد اور شیخ الجامعہ جناب سراج حسین کی صدارت میں ایک اعلا سطحی کمیٹی تشکیل دی گئی جس میں ہندستان کے مشہور و معروف علمائے دین، دینی مدارس کے منتظمین، سنجیدہ اور باصلاحیت سماجی کارکنان کو شامل کیا گیا اور ان کے سامنے یہ مسئلہ رکھا گیا۔ چنانچہ بلا تاخیر کمیٹی کے ارکان نے عوام کے نام ایک اپیل جاری کی۔ جو یونیسیف کے تعاون سے اردو زبان میں بھی شائع کی گئی تا کہ مسلم عوام تک علمائے دین کی بات پہنچے اور پولیو ڈراپ سے متعلق ان کا ذہن صاف ہو جائے۔ قرآن اور حدیث کی روشنی میں بچوں کی صحت سے متعلق والدین کے فرائض نیز حفظانِ صحت کے تحت آنے والے فرمانِ الٰہی اور فرمانِ رسول پر مشتمل ایک کتابچہ بھی شائع کیا گیا جس کا بیشتر اہتمام جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ڈاکٹر زبیر مینائی کی نگہداشت میں ہوا۔ یہ کتابچے بھی مسلم علاقوں میں مفت تقسیم کیے گئے۔ اس سلسلے میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شیخ الجامعہ نے بھی اپنی طرف سے اردو اخباروں میں اپیل شائع کی جس میں مسلمانوں سے بڑھ چڑھ کر پلس پولیو میں حصہ لینے کی درخواست کی گئی۔ جامعہ ہمدرد کے رضا کاروں نے مقامی مدارس کے ناظمین اور مساجد کے ائمہ سے رابطہ قائم کیا۔ پہلے انھیں اعتماد میں لیا اور پھر ان سے یہ التماس کیا کہ وہ اپنے علاقے کے مسلمانوں کو پولیو ڈراپ سے متعلق افواہ سے نجات دلائیں۔ مختصر یہ کہ ڈیڑھ سال کی مسلسل جدوجہد اور انتھک محنت کا یہ نتیجہ ہے کہ آج مسلمانوں میں پولیو ڈراپ کے خلاف وہ غلط فہمی اور نفرت نہیں پائی جاتی جو ڈیڑھ سال قبل پائی جاتی تھی۔ اور اب وہ خوشی خوشی اپنے بچوں کو پولیو ڈراپ پلا رہے ہیں اور آج کی تاریخ میں ہندستان میں صرف 9 بچے پولیو سے متاثر ہیں جن میں اتر پردیش میں ایک بچہ اس مرض میں مبتلا پایا گیا۔ اس وقت اس بیماری کا وائرس صرف ہاپڑ اور بدایوں میں پائے جانے کی اطلاعات ہیں۔ اس وقت ہندستان میں پولیو سے متعلق یہ تاریخی لمحات ہیں کہ جب پولیو وائرس ہندستان میں اتنی محدود اور کمزور حالت میں ہے۔ اس مضمون کو اس وقت شائع کرنے کا عین مقصد بھی یہی ہے کہ اتر پردیش کے علاوہ دیگر ریاستوں جیسے دہلی، بہار، مغربی بنگال، تامل ناڈو اور کرناٹک کے عوام تک بھی پولیو مخالف مہم کی روداد پہنچے۔ اس وقت بہار میں 4، دہلی میں 1، مغربی بنگال میں 1، تامل ناڈو میں ایک اور کرناٹک میں بھی پولیو کا صرف ایک کیس موجود ہے۔ اور اگر عوام متحد ہو کر آنے والے دنوں میں اپنے علاقے کے تمام 5 سال سے چھوٹے بچوں کو یہ دوا پلا دیں اور یہ یقین ہو جائے کہ کوئی بھی بچہ پولیو کی دوا سے محروم نہیں رہا تو یقیناً چند ہی دنوں میں یہ بیماری ہندستان سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو جائے گی۔ لیکن یہاں یہ تنبیہ بھی ضروری ہے کہ ذرا سی غفلت اس بیماری کو دوبارہ پنپنے کا موقع فراہم کر سکتی اور ہماری آئندہ نسلوں کو معذور بنا سکتی ہے۔

چنانچہ راقم السطور کی قارئین سے مودبانہ درخواست ہے کہ وہ اس بیماری کو نیست و نابود کرنے میں معاون بنیں۔ اگر آپ ڈاکٹر ہیں تو اپنے مطب پر پولیو بوتھ کا اہتمام کریں اور اپنے علاقے کے تمام بچوں کو پولیو کی دوا پلائیں۔ اگر آپ مدرس ہیں تو اپنے طلبہ کو ترغیب کریں کہ وہ اپنے گھروں میں موجود چھوٹے بچوں کو پولیو کی دوا پلائیں اور اپنے پڑوسیوں کو بھی اس بات پر آمادہ کریں۔ اگر آپ مدرسے کے مہتمم یا مسجد کے امام ہیں تو اس کو ملّی خدمت تصور کرتے ہوئے سامنے آئیں اور اپنے قرب و جوار میں پائے جانے والے غیر تعلیم یافتہ افراد کو پولیو سے متعلق معلومات فراہم کریں اور ان سے کہیں کہ وہ اپنے بچوں کو پولیو کی دوا ضرور پلائیں اور اگر آپ مشفق والد یا والدہ ہیں تو اپنے بچے کو پولیو کی دوا پلا کر اس کو صحت کا تحفہ دیں۔

قوی امید ہے آنے والی مخصوص تواریخ میں جب آپ کے علاقوں میں پولیو ڈراپ پلائے جائیں گے تو آپ کے گھر یا علاقے میں کوئی بھی بچہ ایسا نہ ہوگا جو پولیو ڈراپ سے محروم رہ جائے۔ یقین کیجیے اگر آپ نے یہ عمل سنجیدگی سے انجام دے دیا تو صرف ایک سال میں پولیو کی بیماری ہندستان سے ختم ہو جائے گی اور آنے والی نسلیں آپ کی احسان مند ہوں گی۔

Dept. of Kulliyat, Jamia Hamdard, New Delhi

□□□

شمس الرحمٰن فاروقی

# اکبر الٰہ آبادی: نئی تہذیبی ریاست اور بدلتے ہوئے اقدار

سب سے پہلے تو میں ذاکر حسین کالج کے پرنسپل اور کالج کے دوسرے ارباب حل وعقد کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ انھوں نے مجھے چودھواں ذاکر حسین یادگاری خطیب مقرر کیا۔ عرفان حبیب، رومیلا تھاپر، سومناتھ چٹرجی، نامور سنگھ اور ان کی طرح کے دوسرے علما اور دانش وروں کی محفل میں میرا بھی نام آئے، یہ میرے لیے افتخار کی بات ہے۔ امید ہے کہ آج کی یہ میری گفتگو کسی نہ کسی حد تک اس معیار کو برقرار رکھے گی جو میرے ان ممتاز پیش روؤں نے قائم کیا ہے۔

ایک بات یہ بھی ہے کہ ذاکر صاحب کے نام کے ساتھ کسی کا نام متعلق ہو، بالواسطہ ہی سہی، تو وہ بھی بجائے خود توقیر کی بات ہے۔ میں چونکہ رسمی طور پر علی گڑھ سے کبھی منسلک نہیں رہا، اس لیے ذاکر صاحب کو قریب سے دیکھنے کی سعادت مجھے نہ حاصل ہوئی۔ لیکن جس طرح ایک طرف مہاتما گاندھی، ابوالکلام آزاد، جواہر لعل نہرو، کے نام ہم لوگوں کے لیے، جو 1930 کی دہائی میں پیدا ہوئے اور جو ہماری جدوجہد آزادی کی گہما گہمی اور پرشور نعروں کے درمیان پلے بڑھے، بالکل گھریلو نام تھے، تو اسی طرح دوسری طرف علامہ اقبال، حسرت موہانی، اور ذاکر صاحب کے بھی نام ہم لوگوں کے لیے گھریلو افراد کے ناموں کی حیثیت رکھتے تھے۔ مجھے اپنے دل و دماغ کی سنسنی اور وہ اہتزاز اب بھی اچھی طرح یاد ہیں جب نوعمری میں مجھے رشید صاحب کی مختصر کتاب ''ذاکر صاحب'' پڑھنے کا موقع ملا تھا۔ میرے خیال میں رشید صاحب کی شائستہ، نفیس طباعی، حاضر جوابی اور ان کی تاب ناک نثر سے بڑھ کر اگر کوئی چیز ممکن تھی تو وہ خود ذاکر صاحب ہی کی ذات تھی جیسی کہ وہ رشید صاحب کے ان اوراق میں جلوہ گر تھی۔

قوم پرستانہ نظریات میں، علم کی وسعت میں، مزاج کی نفاست میں، ذاکر صاحب ہند+مسلم کردار و مزاج کی بہترین خصوصیات کا مثالی نمونہ تھے اور اکبر الٰہ آبادی بھی اسی ہند+مسلم تہذیب کے مثالی نمونہ تھے، اگرچہ وہ اپنے انداز کے ہی ایک شخص تھے۔ اس لیے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ذاکر صاحب کی یادگار میں ایک خطبے کا موضوع اکبر الٰہ آبادی کو بنایا جائے، بالخصوص ایسے وقت میں جب روشن فکری اور غیر متعصب ناذہبیت پر مبنی ہماری بہت سی روایات اور اقدار ہماری موجودہ تہذیب کے دو متضاد دھاروں کے نرغے میں ہیں۔ ایک طرف تو ہم محیط الارضی (globalization) کے نام پر مغربی طرز فکر و حیات کی اندھی اور غیر تنقیدی تقلید کر رہے ہیں اور دوسری طرف ہم پوری کوشش میں ہیں کہ قوم پرستی کے نام پر سارے ملک میں تعلیم، ثقافت اور سیاست کی دنیا میں نو فاشی (neo-fascistic)، میزانیاتی (totalizing) تصورات جاری کر دیے جائیں۔ اس باعث مجھے امید ہے کہ میرا یہ مضمون ان دو عظیم ہندستانیوں کو محض خراج عقیدت کے سوا کچھ اور بھی ہوگا۔

(1)

ہم میں سے اکثر کو اکبر الٰہ آبادی کی زندگی کے اہم حالات سے واقفیت ہے، لہٰذا میں یہاں صرف مختصراً ان کا اعادہ کروں گا۔ سید اکبر حسین کی پیدائش 1846 میں الٰہ آباد کے پاس جمنا پار کے بارہ نامی گاؤں میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم انھوں نے اپنے والد سید تفضل حسین سے حاصل کی۔ ان لوگوں کا خاندان بارہ کے علاقے میں مدت سے آباد تھا۔ قدامت پسند، متوسط الحال، اور عزت نفس کے پاس دار اس خاندان نے قدیم کلاسیکی تعلیم کی روایتوں کو برقرار رکھا تھا، لیکن ان کی مالی حالت بہت اچھی نہ تھی۔ اکبر کو مجبوراً 1863 میں جمنا پر زیر تعمیر پل کے ٹھیکے دار کے یہاں کلرک کی ملازمت کرنی پڑی۔ اس درمیان انھوں نے اپنی کوششوں سے انگریزی کی اچھی استعداد بہم پہنچالی اور 1867 میں عدالت ضلع کے وکلا کا امتحان بآسانی پاس کر لیا۔ انھیں 1869 میں نائب تحصیل دار مقرر کیا گیا، لیکن جلد ہی انھوں نے وہ نوکری ترک کر دی اور ہائی کورٹ کے وکلا کا امتحان پاس کر کے الٰہ آباد ہائی کورٹ میں وکالت کرنے لگے۔

چند برس کی وکالت کے بعد 1880 میں وہ منصف کے عہدے پر فائز کیے گئے۔ اس کے بعد وہ سرکاری ملازمت اور عہدوں میں مسلسل ترقی کرتے ہوئے 1894 میں سشن جج پر تعینات ہوئے۔ جلد ہی وہ بنارس میں، اور پھر دوسرے اضلاع میں ڈسٹرکٹ جج کے عہدے پر متمکن ہوئے۔ حکومت انگلشیہ نے انھیں 1898 میں خطاب خان بہادری سے سرفراز کیا۔ ملازمت سے سبک دوشی (1903) کے بعد وہ کوتوالی الٰہ آباد کے پیچھے اپنی تعمیر کردہ وسیع کوٹھی ''عشرت منزل'' میں آرام اور نیم خانہ نشینی کی زندگی گزارتے رہے۔ اگرچہ اس زمانے میں انھیں آنکھوں کی تکلیف کے علاوہ اور بھی عارضے لاحق ہوئے، لیکن بحیثیت مجموعی ان کے وظیفہ یابی کے دن اچھے گزرے۔

زندگی کے آخری برسوں میں مہاتما گاندھی، ملک کی آزادی اور ہندو

مسلم اتحاد کے لیے مہاتما گاندھی کی جدوجہد سے اکبر کا شغف پہلے سے بھی فزوں ہوگیا۔ انھوں نے ان موضوعات پر اپنے خیالات کا اظہار ایک طویل نظم (یا مختصر نظموں کے طویل سلسلے) ''گاندھی نامہ'' میں کیا۔ اکبر نے 1921 میں اس دنیا سے کوچ کیا۔ اس وقت وہ ملک کے ادبی منظرنامے پر ایک نہایت قوت مند اور سیاسی سماجی اقتدار سے وابستہ شاعر کی حیثیت سے اپنی شہرت کے بام عروج پر تھے۔

گذشتہ پانچ دہائیوں میں اکبر کے ساتھ شعر و ادب کے میدان میں کچھ اچھا سلوک نہیں کیا گیا۔ اپنی زندگی میں تو ان کی توقیر بے حد اور ان کی شہرت غیر معمولی تھی۔ انیسویں صدی کی آخری دو، اور بیسویں صدی کی اول دو دہائیوں میں ان کے دوستوں اور مداحوں کی فہرست تو اس وقت کا who's who in india معلوم ہوتی ہے! اس بات کے باوجود کہ اکبر کو سرسید کے خیالات اور گوشوارہ عمل سے سخت اختلاف تھا، خود سرسید کے دل میں اکبر کا حب و احترام اس قدر تھا کہ انھوں نے اکبر کو علی گڑھ تعینات کرالیا تاکہ ان کی صحبت کا جی بھر لطف اٹھا سکیں[1]۔ اقبال نے اکبر کے ایک شعر کے بارے میں ان کو لکھا کہ آپ نے اس شعر میں ہیگل کا پورا فلسفہ بیان کیا ہے، بلکہ ''ہیگل کے سمندر کو ایک قطرے میں بند کردیا ہے[2]''۔ مدن موہن مالوی نے اکبر الٰہ آبادی سے ہندو مسلم اتحاد کے موضوع پر نظمیں لکھوائیں[3]۔

اکبر کی وفات کے بعد بھی ان کا کلام ایک دو دہائیوں تک بہت مقبول رہا۔ ان کا کلیات تین جلدوں میں 1909 سے 1921 کے درمیان چھپا تھا۔ اکبر کے زمانۂ حیات میں، اور ان کے بعد بھی یہ جلدیں کئی بار چھپیں۔ پہلی جلد تو 1936 تک گیارہ بار چھپ چکی تھی۔ دوسری نے 1931 تک سات اور تیسری نے 1940 تک پانچ اشاعتیں دیکھیں۔ لیکن آج معاملہ بالکل مختلف ہے۔ ''گاندھی نامہ'' (1919 تا 1921) صرف ایک بار 1948 میں چھپی اور مدت سے نایاب ہے۔ خود کلیات کی تیسری جلد کی اشاعت میں بہت تاخیر ہوئی تھی اور وہ اکبر کی وفات سے بمشکل چند ہفتے قبل اگست 1921 میں منظر عام پر آسکی تھی۔ (ممکن ہے ان تعویقوں میں اکبر کے بیٹے اور ان کے کلام کے مختار عام عشرت حسین کی بھی سست مزاجی کو دخل رہا ہو)۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے، عشرت حسین نے کلیات اکبر کی چوتھی جلد کو شائع کرنے کا کوئی اہتمام نہیں کیا، اور نہ ''گاندھی نامہ'' کی اشاعت پر انھوں نے توجہ کی۔ اکبر الٰہ آبادی کے پوتے محمد مسلم رضوی نے ''گاندھی نامہ'' کو 1948 میں کتابستان، الٰہ آباد سے چھپوایا۔ اکبر کا کچھ غیر مطبوعہ کلام قمر الدین احمد بدایونی کی کتاب ''بزم اکبر'' (1940) میں مل جاتا ہے۔ یہ کتاب بھی اب کمیاب ہے۔ سرور تونسوی مرحوم نے مکتبۂ شان ہند سے اکبر کا ایک کلیات شائع کیا تھا اس میں کلیات کی چوتھی جلد کا بھی کچھ کلام شامل ہے۔ صدیق الرحمٰن قدوائی نے ان میں سے کچھ اشعار کو اپنے انتخاب میں درج کیا ہے۔

کلیات اکبر کی چوتھی جلد کراچی سے 1948 میں ضرور چھپی لیکن وہ ہندستان میں بہت کم لوگوں تک پہنچی، اور پاکستان میں بھی اب شاذ و نادر ہی ملتی ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ اس جلد کا وہ نسخہ جو مولانا عبدالماجد دریابادی کی ملک تھا اب دریافت ہوگیا ہے۔ مکتبہ شان ہند کے کلیات اکبر کو عالمانہ یا اقتدار دار ایڈیشن نہیں کہہ سکتے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اب ایک مکمل ایڈیشن شائع کررہی ہے۔ یہ ایڈیشن ہر چند کہ عالمانہ اور تنقیدی نہ ہوگا، لیکن اس میں صحت کا پورا خیال رکھا گیا ہے۔ عبدالماجد دریابادی کے نسخے پر جو حواشی اور ضروری معلومات مولوی دریابادی نے درج کیے تھے، وہ اس ایڈیشن میں شامل کردیے جائیں گے۔ مولوی دریابادی کے بھتیجے جناب عبدالعلیم قدوائی کی عنایت سے اس نسخے کی فوٹو کاپی ترقی اردو کونسل کو مہیا ہوگئی ہے۔

لہٰذا موجودہ صورت حال یہ ہے کہ ہمارے سب سے بڑے طنز نگار کی حیثیت سے اکبر کی شہرت کو کوئی بٹہ نہیں لگا ہے، لیکن ان کے پڑھنے والوں کی تعداد کم ہوگئی ہے۔ اردو کے نقادوں نے کم و بیش یک زبان ہوکر ان کی نکتہ چینی کی ہے کیوں کہ اکبر انھیں ترقی، سائنس اور روشن خیال طرز فکر و حیات کے دشمن نظر آتے ہیں۔

ہمارے نقادوں نے اکبر کے ساتھ جو سلوک کیا، بلکہ یوں کہیے کہ جو بدسلوکی روا رکھی، اس کی کم از کم دو وجہیں اور ہیں۔ ایک وجہ تو ادبی ہے، اور دوسری غیر ادبی۔ ادبی وجہ تو یہ ہے کہ اردو نقادوں کی فہرست استناد میں طنزیہ اور مزاحیہ شاعری بہت پست مقام کی حامل ہے۔ اردو میں طنزیہ مزاحیہ شاعری کی روایت بے شک بہت تو انگر اور توانا ہے، لیکن اوائل بیسویں صدی کے اردو نقادوں کی فہرست استناد میں طنزیہ اور مزاحیہ شاعری بہت پست مقام کی حامل ہے۔ اردو میں طنزیہ مزاحیہ شاعری کی روایت بے شک بہت تو انگر اور توانا ہے، لیکن اوائل بیسویں صدی کے اردو نقادوں کی تربیت ایسی ہوئی تھی کہ وہ میتھیو آرنلڈ (matthew arnold) کی اس بات کو برحق سمجھتے تھے کہ ''اعلیٰ سنجیدگی'' (high seriuousness) شاعری کا جزو لاینفک ہے۔ کوئی پچاس برس ادھر کا اپنا تجربہ بھی مجھے اب تک یاد ہے کہ مجھے اس وقت کتنا رنج اور کس قدر زیادتی اور دھوکے کا احساس ہوا جب میں نے آرنلڈ کا یہ قول پڑھا کہ انگریزی کے مشہور طنز نگار شعرا ڈرائڈن (john dryden) اور پوپ (alexander pope) انگریزی شعر کے نہیں، بلکہ انگریزی نثر کے شاہکار ہیں۔ اگر میرے اساتذہ اس رائے کو پوری طرح تسلیم نہ بھی کرتے تھے تو انھیں یہ فیصلہ دینے میں کوئی جھجک بھی نہ ہوتی کہ ڈرائڈن درجۂ دوم کا شاعر ہے۔ اس پر طرّہ محمد حسین آزاد کی تنقیدیں اور تعریفیں کہ طنز اور ہجو ''غیر

مہذب'' اصناف ہیں، بالخصوص جب سودا جیسا شاعر انھیں برتے۔ سودا کے بارے میں محمد حسین آزاد کو سنیے:

بڑھاپے تک شوخی طفلانہ ان کے مزاج میں امنگ دکھاتی تھی...... ذرا سی ناراضی میں بے اختیار ہو جاتے تھے۔ کچھ اور بس نہ چلتا تھا، جھٹ ایک ہجو کا طومار تیار کر ڈالتے تھے۔ غنچہ نام کا ان کا غلام تھا، ہر وقت خدمت میں رہتا تھا اور ساتھ قلم دان لیے پھرتا تھا۔ جب کسی سے بگڑتے تو فوراً پکارتے، ارے غنچہ لا تو قلمدان...... پھر شرم کی آنکھیں بند۔ اور بے حیائی کا منہ کھول کر وہ وہ بے نقط سناتے تھے کہ شیطان بھی امان مانگے[4]

یہ باتیں اس نتیجے کے لیے کافی تھیں کہ اردو کے نقاد تمام ظریفانہ اور نظریہ شاعری کو شک کی نگاہ سے دیکھنے لگ جائیں۔ اکبر جس جوش اور قوت کے ساتھ سیاسی اور سماجی مسائل کے ساتھ اپنی شاعری میں معاملہ کرتے تھے وہ ان کی گری ہوئی پوزیشن کو سنبھالنے کے لیے کافی نہ سمجھا گیا۔ آج شاید ہی کوئی اردو کا نقاد ایسا ہوگا جو اکبر کو اردو کے دس بڑے شعرا میں شمار کرے۔

سرور صاحب ان چند نقادوں میں ہیں جنھوں نے اکبر کے مقاصد کی متانت اور وزن کو سمجھا، اور ان کی بصیرت کی قوت کا اعتراف کیا۔ انھوں نے کہا کہ'' آپ ان کے خیالات سے اتفاق نہ بھی کریں، مگر ان کے اشعار پر مسکرائے اور اکثر غور کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ یہی ان کا مقصد تھا۔''[5] لیکن اکبر کے لیے تا حیات جذبۂ تحسین رکھنے کے باوجود سرور صاحب بھی خود کو اس بات پر تیار نہ کر سکے کہ اردو کے عظیم ترین شعرا کی محفل میں اکبر کے لیے بھی جگہ استوار کی جائے۔

موجودہ زمانے میں اکبر کی مقبولیت کم ہونے کی ایک وجہ ان کی ذاتی زندگی اور ان کے سیاسی عقائد کے درمیان تضاد کی واضح خلیج بھی ہے۔ اپنے شعر میں تو اکبر خود کو تمام انگریزی طور طریقوں کا سخت دشمن ظاہر کرتے ہیں۔ لیکن وہ خود انگریزی راج کے ایک خاصے بزرگ عہدے دار تھے، اور انھیں صاف صاف اس بات پر فخر بھی تھا کہ ٹامس برن (thomas bum)، جو ایک زمانے میں یو.پی. کا چیف سکریٹری تھا، ان کا بہت لحاظ کرتا تھا[6]۔ بلکہ وکٹوریہ کی گولڈن جوبلی (1887) کے موقعے پر انھوں نے ''مسٹر ہادیل، جج'' کی فرمائش پر ایک مدحیہ قصیدہ بھی لکھا[7]۔ انگریزوں سے سخت نفرت کے باوجود اکبر نے اپنے بیٹے عشرت حسین کو اعلا تعلیم کے لیے لندن بھیجا اور پھر ان کا یو.پی. کی سول سروس میں بطور ڈپٹی کلکٹر شریک ہونا بھی منظور کیا۔ ظاہر ہے کہ ان باتوں کا کوئی جوڑ نکتہ چینی کے ان فقروں اور ران طنز بھرے تحقیری اشعار سے نہیں جو اکبر کی زبان قلم سے اہل مغرب اور ان کے مداحوں کے لیے مسلسل ادا ہوتے رہتے تھے۔

اس بات کا امکان ہے کہ اکبر کو اس تضاد کا احساس رہا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ ذاتی زندگی میں اس دورنگی[8] کے احساس نے ان کے یہاں زجرو ملامت کی لے اور تیز کر دی ہو اور مغربی، خاص کر برطانوی طور طریقوں اور نظام حیات سے ان کا اظہار برأت شدید تر کر دیا ہو۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ وہ اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ دھارے کے خلاف کوئی تیر نہیں سکتا، لیکن ان کی نگاہوں میں اصل المیہ کچھ اور تھا۔ اکبر کے خیال میں المیہ درحقیقت یہ تھا کہ وہ لوگ بھی غرقابی سے نہ بچ سکے جنھوں نے دھارے کے ساتھ بہنا پسند کیا۔ خود کو جدید [انگریز] بنانے کے چکر میں ہندستانیوں نے اپنا ماضی، اپنی روایات، اپنے نظام عقائد، سب تج دیے، لیکن پھر بھی وہ خود کو مغربی رنگ میں پوری طرح رنگا ہوا، وہ جدید انسان نہ بنا سکے جس کی توقع مکالی (macaulay) کو تھی۔ مندرجہ ذیل شعر میں دل سوزی، المیہ دردمندی کی حد کو چھو رہی ہے۔

مرید دہر ہوئے وضع مغربی کر لی
نئے جنم کی تمنا میں خودکشی کر لی[9]

غور طلب بات یہ ہے کہ شعر میں فاعل کا اظہار نہیں کیا گیا ہے۔ خودکشی کرنے والا واحد غائب، واحد متکلم، جمع غائب، جمع متکلم، واحد حاضر، جمع حاضر، کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ ایک نسبتاً طویل قطعے میں اکبر نے اسی کشمکش کا اظہار ایک ذاتی درد اور احساسِ زیاں کے ساتھ کیا ہے، لیکن یہاں بھی متکلم کوئی فرد واحد بھی ہو سکتا ہے اور اس زمانے کے متوسط گھرانے کا پورا مسلم معاشرہ بھی۔

قدیم وضع پہ قائم رہوں اگر اکبر
تو صاف کہتے ہیں سید یہ رنگ ہے میلا
جدید طرز اگر اختیار کرتا ہوں
خود اپنی قوم مچاتی ہے شور و واویلا
جو اعتدال کی کہیے تو وہ اِدھر نہ اُدھر
زیادہ حد سے دیے سب نے پاؤں ہیں پھیلا
ادھر یہ ضد ہے کہ لمنیڈ بھی چھو نہیں سکتے
ادھر یہ دھن ہے کہ ساقی صراحی مے لا
ادھر ہے دفتر تدبیر و مصلحت ناپاک
ادھر ہے وحی ولایت کی ڈاک کا تھیلا
غرض دو گونہ عذاب است جان مجنوں را
بلائے صحبت لیلیٰ و فرقت لیلیٰ[10]

اکبر کے قدح خواں (اور قریب قریب سب ہی جدید نقاد اکبر کے قدح خواں ہی ہیں) مندرجہ بالا طرح کے اشعار اور نظموں کو نظر انداز کرتے ہیں، اور سارا زور اکبر کے اسی کلام پر صرف کرتے ہیں جس کی رو سے انھیں نئی

روشنی کا اندھا اور استدلال سے عاری نقاد ثابت کیا جاسکے، یا پھر یہ دکھایا جاسکے کہ اکبر جان بوجھ کر الٹی گنگا بہانا چاہتے تھے کہ وہ جس ماضی کے دلدادہ تھے وہ عموماً ناپسندیدہ اور بہرطور مردہ یا نزع کی حالت میں گرفتار تھا۔ اور اکبر کے بارے میں یہ فیصلہ صرف ان لوگوں کا نہ تھا جو برطانوی راج کو ہندستان کے لیے باعث برکت نہیں تو تاریخ کے سفر کا ایک ضروری پڑاؤ یقیناً قرار دیتے، اکبر کے لیے ہمدردی ان لوگوں کے بھی دل میں نہ تھی جو برطانوی راج کے مخالف تھے اور اس سے انھیں کچھ لینا دینا نہ تھا۔

اکبر کے بارے میں زیادہ تر جدید تنقید میں تصور کی تہہ دھارا، اور بعض اوقات بالکل کھلی کھلی رائے یہی ہے کہ ٹھیک ہے، وہ اپنے زمانے میں بے حد مقبول تھے اور عمدہ طنزیہ شاعر تھے، لیکن جن اقدار، تصورات اور آدرشوں کو وہ قیمتی گردانتے تھے انھیں تو اکبر کے عین حیات ہی میں شکست فاش نصیب ہوچکی تھی۔ لہٰذا جب وہ اقدار ہی نہ رہے جن سے اکبر کی شاعری کو ایقان اور عقیدے کا سہارا تھا، تو پھر ناگزیر ہے کہ ان کی شاعری دوسروں کے لیے جگہ خالی کردے۔ نقادوں کا کہنا یہ ہے کہ اکبر کا گوشوارۂ عمل منفی ہے، اس لیے ان کی شاعری بھی منفی ہے، اور ہم اسے آج کے جدید دور میں نہ کسی قوت کا حامل دیکھ سکتے ہیں نہ معنویت کا۔

لیکن یہ بات ہی غلط ہے کہ جو لوگ، یا پارٹی، یا تصورات، جو کسی طنز نگار کا ہدف بنے تھے ان کی شکست یا موت کے ساتھ ان کے بارے میں لکھی ہوئی طنزیہ تحریر بھی متروک یا ناقبول ہوجاتی ہے۔ اگر طنز و مزاح صرف وقتی اور مقامی معنویت کی شے ہیں، اور زمانہ بدلنے یا گزرنے کے ساتھ ان کی قیمت، معنویت، یا اہمیت کم ہوجاتی ہے تو یونان کے ارسٹوفینیس (Aristophanes) سے لے کر سنسکرت کے طنز و ہجو نگاروں تک، پھر عرب و ایران کے (فحش یا غیر فحش) ہجو گویوں سے لے کر انگریزی کے جاتھن سوئفٹ (Jonathan Swift) اور اردو کے جعفر زٹلی تک سینکڑوں مصنف ہیں جن کی بہت ساری نظم و نثر آج ہمارے لیے بے معنی ہوتی، بلکہ وہ آج باقی ہی نہ ہوتی۔ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے اور اس طرح یہ بھی ظاہر ہے کہ اکبر کی طنزیہ شاعری کو ہم صرف یہ کہہ کر ٹال نہیں سکتے کہ زمانے کے ساتھ اکبر کی معنی خیزی بھی گزر گئی اور آج وہ دفتر پارینہ ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اپنے زمانے کے مسائل کی طرف اور خاص کر ''ترقی'' سے متعلق مسائل کی طرف اکبر کا رویہ اتنا سادہ اور سیدھی لکیر جیسا بھی نہ تھا جیسا کہ ان کے نقاد ہمیں باور کرانا چاہتے ہیں۔ اکبر بڑے پیچیدہ شاعر ہیں۔ انھیں صبح کے اخبار کی طرح نہیں پڑھا جاسکتا۔ اکبر کے شکوک اور خوف اور آئندہ زمانے کے بارے میں ان کی تاریک پیشین گوئیاں صرف ایک ضدّی قدامت پسند ذہن کی پیداوار نہیں۔ ان میں بہت کچھ اور بھی ہے۔

سچ پوچھیے تو اکبر اپنے زمانے کے ان چند لوگوں میں تھے جنھوں نے یہ بات دیکھ لی تھی کہ سرسید کے اصلاحی گوشوارۂ عمل اور لارڈ میکالی (Lord Macaulay) کے منصوبوں میں بہت کچھ مشترک تھا۔ اکبر خوب سمجھتے تھے کہ جس چیز کو ''ہندستانی نشاۃ الثانیہ'' کہا جارہا ہے، یا کہا جائے گا، وہ پچھلی جدیدکاری کی ایک طاقتور لہر کے سوا کچھ نہیں۔ سرسید کے ''اینگلو اورینٹل'' (Anglo Oriental) کالج علی گڑھ میں بہت کم عنصر ایسا تھا جسے ''اینگلو'' (انگریزی) کہا جاسکتا تھا، اور ''اورینٹل'' (مشرقی) عنصر تو اس سے بھی کم تھا۔ ارادہ اور ذہن کی اپنی تمام تر قوت اور نیک نیت کے باوجود سرسید کے پاس وہ ساز و سامان نہ تھا، اور نہ ہی وہ صلاحیت تھی کہ وہ جدید سائنسی چھان بین اور مذہبی عقیدے دونوں کے امتزاج پر مبنی کوئی واحد ذہنی نظام تیار کرسکیں۔ یورپی روشن فکری (Englishrenment) کے معاصر نظام افکار میں سائنسی اور تفتیشی رویوں اور تصور کائنات کی کارفرمائی تھی، اور برطانوی تہذیب اس نظام افکار کی نمائندگی بھی خوب کرتی تھی۔ لیکن اس نظام افکار اور تصور کائنات کو آزادانہ اور دانشورانہ طور پر اختیار کرنا دیگر بات تھی، اور غلامانہ، یا خوشامدانہ، اور کم و بیش ایک کم تر درجے کے معاون کے طور پر اس کی تحسین اور انگریزی نوآبادیاتی + انتظامی ڈھانچے میں ہندستان کی شرکت اور ہی چیز تھی۔ ہندستان میں انگریزوں کی حکمت عملی اس بات پر مبنی تھی کہ جدید سائنسی فکر ہندستان میں آئے ضرور، لیکن وہ انگریز کے نوآبادیاتی + انتظامی ڈھانچے کی تحسین اور اس میں شرکت، یا اس کے ساتھ تعاون کے طور پر آئے۔ یعنی اگر نئے علوم و افکار کو حاصل کرنا ہے تو انھیں انگریزوں کی دین کے طور پر ہی حاصل کرو۔ انگریزوں نے اس بات کی پوری کوشش کی تھی کہ دونوں چیزیں (جدید علوم و افکار اور انگریزی سامراج سے خوش عقیدگی) ساتھ ساتھ آئیں۔ یہ ایسی حقیقت تھی جو اکبر کے زمانے میں تمام ہندستانیوں پر افشا نہیں تھی۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل کی ہماری تہذیبی تاریخ میں اکبر اور اقبال کے سوا شاید ہی کوئی ایسا ہوگا جس نے اس حقیقت کا احساس و اظہار اس قدر زور و قوت سے کیا ہو۔ اور خاص کر اکبر تو یہ بات کہتے نہ تھکتے تھے کہ یہ محض خوش خیالی اور پرامیدی ہے، ان دو رویوں کا یکجا ہونا اجتماع نقیضین کا حکم رکھتا ہے، اور ان پر بیک وقت ایک ہی عالم میں عمل پیرا ہونا غیر ممکن ہے۔

اکبر کو اپنے طور پر سرسید سے محبت بھی تھی۔ سرسید کے خلوص نیت، خلوص عمل، مشقت برائے قوم، تعلیم، اور خاص کر ہندستانی مسلمانوں کی تعلیم کے مقصود سے ان کے دلی لگاؤ کی وہ قدر کرتے تھے۔ لیکن سرسید اور ان کی جسمانی اور معنوی اولادوں کا جب وہ موازنہ کرتے تو ''اولادوں'' میں انھیں بہت کم باتیں قابل تعریف آتیں، جب کہ علی گڑھ کے بڑے میاں کے لیے

ان کے دل میں جگہ تھی۔ یہ شاید بے وجہ نہیں کہ "کلیات اکبر" کی ابتدا ایک غزل سے ہوتی ہے جس کے تین شعر بالترتیب حسب ذیل ہیں

واہ کیا راہ دکھائی ہے ہمیں مرشد نے
کر دیا کعبے کو گم اور کلیسا نہ ملا
رنگ چہرے کا تو کالج نے بھی رکھا قائم
رنگ باطن میں مگر باپ سے بیٹا نہ ملا
سید اٹھے جو گزٹ لے کے تو لاکھوں لائے
شیخ قرآن دکھاتے پھرے پیسہ نہ ملا[11]

جیسا کہ صاف ظاہر ہوگا، پہلے شعر میں ہندستانیوں، اور خاص کر ہندستانی مسلمانوں کے کج دار و مریز کا، اور اس کو حل کرنے میں ان کی ناکامیوں کا ذکر ہے۔ اس شعر کا ہدف سرسید تو ہیں ہی، اور اس کو حل کرنے میں انکی ناکامیوں کا ذکر ہے۔ اس شعر کا ہدف سرسید تو ہیں ہی، لیکن اس کے سماجی اور اخلاقی مضمرات دور دور تک ہیں۔ دوسرے شعر میں سرسید کو بالواسطہ خراج تحسین ہے کہ خود ان کا تو دل صحیح مقام پر تھا۔ لیکن ان کی اولادوں نے باپ دادا کے روحانی اور دانشورانہ ورثے کو ضائع کر دیا۔ تیسرے شعر میں واضح طور پر سرسید پر یہ رائے ظاہر کی گئی ہے کہ ان کے طریق فکر و عمل نے مسلمانوں کو ترغیب دی کہ وہ قرآنی طرز حیات و فکر کو چھوڑ کر انگریزی طرز حیات وفکر اختیار کریں۔

سرسید کے انتقال پر اکبر نے دو شعر کا ماتی قطعہ لکھا۔ اس میں انھوں نے سرسید کی راست نیت اور مشقت برائے قوم کا پورا اعتراف کیا۔

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا تھا
نہ بھولو فرق جو ہے کہنے والے کرنے والے میں
کہے جو چاہے کوئی میں تو یہ کہتا ہوں اے اکبر
خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں[12]

جب سید محمود الہ آباد ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے تو انھیں یہ معلوم کر کے رنج ہوا کہ ہائی کورٹ کے انگریز جج صاحبان کی شرائط ملازمت اور مراعات اور ہندستانی جج صاحبان کی شرائط ملازمت اور مراعات یکساں نہ تھیں۔ دونوں کے فرائض اور اختیارات ایک ہی تھے، لیکن انگریز ججوں کو ہر چیز میں ہندستانیوں پر تفوق تھا۔ کچھ مدت بعد سید محمود نے حکومت کے نام ایک محضر تیار کیا جس میں انھوں نے مطالبہ کیا کہ انھیں اور انگریز جج صاحبان کو شرائط ملازمت اور مراعات میں ہر طرح برابر قرار دیا جائے۔ اس مطالبے کی بنیاد انھوں نے اصول مساوات و معدلت کے بجائے اس بات پر رکھی تھی کہ انگریزی زبان کے علم، انگریزی تعلیم، انگلستان میں قیام، رکھ رکھاؤ اور طرز بود و باش کے لحاظ سے وہ ہر طرح انگریز تھے۔[13] ظاہر ہے کہ یہ بات اکبر الہ آبادی کے بھی کان میں پڑی ہوگی، کہ وہ بھی اس وقت کی یو. پی. جوڈیشل سروس میں اچھے عہدے پر تھے۔ سید محمود کے طرز فکر و استدلال میں اکبر کو اپنے بدترین خوف اور شکوک سچ ہوتے نظر آئے ہوں تو کیا تعجب ہے۔ آگے چل کر انھوں نے سید محمود اور الہ آباد ہائی کورٹ کے چیف جسٹس سر جان اَیج (Sir John Edge) کے درمیان ناچاقی، چیف جسٹس کے عجب و غرور، اور پھر ہائی کورٹ کی ججی سے سید محمود کے استعفیٰ کا قصۂ نامرضیہ بھی سنا ہوگا۔

ان باتوں نے اکبر کو اپنے خیالات پر اور بھی مستحکم کیا ہوگا اور انھوں نے اپنے موقف کو اور بھی مبنی برحق سمجھا ہوگا۔ ان کو اس بات پر سخت غم و غصہ رہا ہوگا کہ سید محمود جو ایک انتہائی قدیم اور ممتاز خاندان کے چشم و چراغ تھے، جنھیں اردو کے علاوہ فارسی اور عربی ادب کی بھی کثیر معلومات تھی، اور جو ہند+مسلم تہذیب کی بہترین روایات کے پروردہ تھے، ان جیسا شخص اپنی انگریزیت کی توثیق اس غلو کے ساتھ کرے کہ مشرقیت کا بالکل پتہ ہی نہ باقی رہے۔ پھر یہ کچھ حیرت کی بات نہیں کہ سید محمود کے انتقال (1903) پر اکبر کا قطعہ اگر ایک طرف مختصراً ماتم درارانہ ہے تو دوسری طرف اس میں ایک تلخ فتح مندی بھی نمایاں ہے۔

نہ وہ بک رہ گئے نہ سرسید
دل احباب سے نکلتی ہے آہ
ذات محمود سے تسلی تھی
لی انھوں نے بھی آج خلد کی راہ
بولی عبرت کہ ہوش میں آؤ
اے حریصانِ شان و شوکت و جاہ
مٹ گیا نقش احمد و محمود
رہ گیا لا الٰہ الا اللہ[14]

لہٰذا اکبر کے تضادات ان کے اپنے زمانے کے تضادات تھے اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ آخری دنوں میں وہ اپنے ان داخلی تضادات کے حل کی طرف ٹٹولتے ہوئے سہی، لیکن بڑھ رہے تھے۔ اپنی زندگی کے بیشتر تمام میں وہ ہندستانی محاورے میں "گورنمنٹ سرونٹ" (government servant)، اور پھر "پنشنر جج" رہے تھے۔ اور وہ اپنے اندر یہ قوت نہ دیکھتے تھے کہ وہ جدوجہد آزادی اور مہاتما گاندھی کی کھلی حمایت کریں اور عملی سیاست میں کود پڑیں۔ لیکن انگریز، انگریزی راج، مغربی تہذیب اور ان کے حامیوں پر کھلے الفاظ میں نکتہ چینی میں وہ کبھی پیچھے نہ رہے۔ اور یوں بھی، شاعر کا کام ڈنڈا یا جھنڈا اٹھانا نہیں۔ "گاندھی نامہ" کے بہت پہلے انھوں نے دو الگ الگ شعروں میں کہا تھا

مدخولۂ گورنمنٹ اکبر اگر نہ ہوتا
اس کو بھی آپ پاتے گاندھی کی گوپیوں میں[15]
بدھو میاں بھی حضرت گاندھی کے ساتھ ہیں
گو خاک راہ ہیں مگر آندھی کے ساتھ ہیں[16]

اکبر نے اپنے لیے لفظ "مدخولہ" استعمال کیا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ انگریزی حکومت کے ملازموں کو وہ بیگم کے مقابلے میں داشتہ سے زیادہ درجہ دینے کو تیار نہ تھے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بلند مرتبہ دنیاوی حیثیت کے باوجود انھیں اپنے آپ سے ایک طرح کی نفرت تھی کہ وہ انگریز کے نوکر تھے۔ مہاتما گاندھی کے پیروؤں کو اکبر نے "گوپی" کہا ہے۔ اس طرح گاندھی جی کی شخصیت ان کی نگاہ میں غیر معمولی طور پر، بلکہ تقریباً فوق الانسانی طور پر کرشمہ جاتی حیثیت رکھتی تھی۔ لفظ "گوپی" کے استعمال اور سری کرشن جی مہاراج کی طرف اشارے کی بنا پر اس شعر میں معنی کی متعدد تہیں ہیں۔ یہاں میں صرف ایک کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں: وطن عزیز کے لیے مہاتما گاندھی اصول مردی اور قوت تولید اور زرخیزی کا درجہ رکھتے ہیں۔ وطن عزیز اصول نسائی کا حکم رکھتا ہے، جسے گاندھی کے وجود سے قوت نمو اور زرخیزی حاصل ہوگی۔ دوسرے شعر میں اکبر نے "بدھو میاں" کی اصطلاح یا علامت خود اپنے لیے استعمال کی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مولانا محمد علی کو گمان گزرا تھا کہ "بدھو میاں" کو اکبر نے خود مولانا محمد علی کا مدلول بنایا تھا۔ مولانا اس پر شاید کچھ آزردہ بھی ہوئے تھے اور اکبر نے صفائی پیش کی تھی کہ ایسا نہیں ہے۔ "گاندھی نامہ" کے ایک شعر میں صاف اشارہ ہے کہ "بدھو میاں" سے کوئی اور نہیں بلکہ اکبر الہ آبادی ہی مراد ہیں

بدھو کا لفظ تھا فقط اک مصلحت کی بات
دل میں مرے نہاں ہے جو ہے اصلیت کی بات[17]

اکبر نے "گاندھی نامہ" اپنی عین حیات میں شائع نہ کیا۔ قمر الدین احمد کا بیان ہے کہ اکبر کہتے تھے کہ میں انگریزوں کی مخالفت کھل کر کروں تو یہ بے اثر اور نقصان دہ بات ہوگی۔ انھوں نے قمر الدین احمد سے ایک بار کہا کہ "جب میرا یقین ہے کہ حکومت سے کھل کر لڑنا مضر ہے تو بھلا میں کیا کہوں، اور میرے کہنے سے ہو بھی کیا سکتا ہے؟" زندگی کے بالکل آخری دنوں (فروری، 1921) میں اکبر نے قمر الدین احمد سے کہا:

لوگوں کا خیال ہے میں اپنی پنشن کے خیال سے قومی کام میں سامنے نہیں آیا۔ یہ غلط ہے اگر آج میں روپے کی خاطر قوم کا کام کروں تو کیا مجھ کو پنشن سے زیادہ فائدہ نہ ہو؟...... میں دو باتوں سے گھبراتا ہوں، ایک تو عشرت کے معصیت میں پڑنے کے خیال سے، دوسرے اس خیال سے کہ میں اس پیرانہ سالی میں اپنے جسم میں اتنی سکت نہیں پاتا کہ جیل کے مصائب اٹھا سکوں[18]۔

لیکن "گاندھی نامہ" میں اکبر پوری طرح کھل کھیلے۔ انھوں نے کتاب کے سرنامے ہی پر یہ شعر لکھا

انقلاب آیا نئی دنیا نیا ہنگامہ ہے
شاہ نامہ ہو چکا اب دور گاندھی نامہ ہے[19]

گویا وہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ فردوسی کا شاہنامہ جو ملک گیری اور کشورستانی کے اصول پر مبنی ہے، اب اس کا زمانہ ختم ہوا، یعنی انگریزوں کی ملک گیری کے دن گئے، اب گاندھی، یعنی عوام الناس کے اصول کی داستان کا زمانہ ہے۔ شاہی اور کشور کشائی کے دن منسوخ ہوئے۔

(جاری)

(بشکریہ "شب خون" جولائی 2002)

مسدود راہیں

ترجمہ اور تعارف: زاہدہ زیدی

ان پانچوں ڈراموں کا شمار جدید مغربی تھیٹر کے اہم ترین فن پاروں میں ہوتا ہے۔ ہمہ گیر وژن، فنی ندرت اور گہری معنویت کے حامل یہ ڈرامے قبول عام کی سند حاصل کر چکے ہیں۔ ان کے مصنفین ہیں یوجین ایونیکو، میگول دی یونامونو، ژاں پال سارتر اور سیموئل بیکٹ۔

(پہلا ایڈیشن)، صفحات: 406، قیمت: 126.00 روپے

اردو زبان کا جادو (حصہ اول، دوم)

مرتبین: مسز پی۔ شیاملا کماری
پروفیسر ماہ جبیں نجم

اردو سکھانے والی دو آسان کتابیں

جو تدریس زبان کے جدید سائنٹفک اصولوں کو سامنے رکھ کر مرتب کی گئی ہیں۔ یہ کتابیں بچوں کے ساتھ ساتھ اردو سیکھنے والے بالغوں کے لیے بھی کارآمد ہیں۔
(حصہ اوّل، قیمت: 43 روپے)، (حصہ دوم، قیمت: 46.00 روپے)

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی

وشنو کھرے

# موت نیند میں چلے جانے کا نام ہے

اسے ہندی کی خوش قسمتی کہا جائے یا بدقسمتی، لیکن یہ سچ ہے کہ اس میں انگریزی میں لکھنے والے ہندستانی نژاد ادیبوں کے تئیں دلچسپی اور جانکاری بہت کم ہے۔ اس لیے جب ڈوم موریس جیسے ہندستانی انگریزی شاعر کی موت کی خبر آتی ہے تو سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ ان کے بارے میں کچھ لکھا بھی جائے تو ہندی دنیا اس سے کیسا رشتہ بنا پائے گی۔ ابھی چند ماہ قبل ہی جدید ہندستانی شاعری کی عظیم ہستی نسیم ایزے کیئل کی موت (2004-1924) ہوئی تھی، جنھوں نے کبھی اپنی میگزین 'پوئٹری انڈیا' میں ہندی نظموں کے تراجم بھی شائع کیے تھے۔ لیکن وہ بھی ہندی دنیا کے لیے نامانوس ہی رہے۔ اب ڈوم موریس کی ناگہانی موت (2004-1938) ہوئی ہے اور بلاشبہ بین الاقوامی ادبی پلیٹ فارم پر وہ ایزے کیئل سمیت تمام ہندستانی انگریزی شاعروں میں سب سے زیادہ مقبول شاعر ہیں، پھر بھی ہندی میں انھیں لگ بھگ کوئی نہیں جانتا۔

پچھلی صدی کی پانچویں دہائی میں جب کسی کو یہ گمان بھی نہیں تھا کہ کبھی سلمان رشدی اور وکرم سیٹھ وغیرہ کی نسل انگریزی میں آئے گی، 1958 میں صرف 19 سال کی عمر میں ڈوم موریس نے اپنے اولین شعری مجموعہ 'اے بگننگ' پر ہاتھارنڈن ایوارڈ جیت کر تمام انگریزی ادب میں سنسنی پھیلا دی تھی۔ 'وائلڈ اوٹس ان پلینٹی، آئی ہیڈ سوڈ بفور آئی واز ٹوئنٹی'، ان کے مشہور مصرعے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ مہارانی الیزابیتھ نے بھی ان کی نظموں کی تعریف کی تھی۔

ڈوم کے والد کا نام فرینک موریس تھا جو ہندستانی کیتھولک تھے۔ وہ اپنے وقت کے غالباً سب سے زیادہ معزز انگریزی صحافی تھے۔ ان کے ممبئی واقع مغربی کلچر میں پلے بڑھے خاندان میں صرف انگریزی ہی بولی جاتی تھی۔ ڈوم کی ماں بعد میں دماغی طور پر مفلوج ہوگئی تھیں، لیکن خاندان میں ایک دوسرے کے تئیں کافی محبت تھی جس کا ذکر ڈوم کی نظموں میں بار بار آتا ہے۔ ان کے والد اس قدر خوش حال اور اتنی پہنچ والے تھے کہ اپنے بیٹے ڈوم کو حصول تعلیم کے لیے آکسفورڈ بھیج سکتے تھے۔ لیکن اس سے پہلے 13 سال کی عمر میں ہی ڈوم اپنے والد کے دیے ہوئے ٹائپ رائٹر پر ایک انگلی سے نظمیں لکھنے لگے تھے۔ انھوں نے تاحیات ایک انگلی سے ہی ٹائپ کیا۔

15 سال کی عمر کو پہنچتے پہنچتے ان کی تخلیقات 'السٹریٹیڈ ویکلی آف انڈیا' میں شائع ہونے لگی تھیں، جس کے شعبۂ ادب کے ایڈیٹر 29 سالہ نسیم ایزے کیئل تھے۔ ایزے کیئل نے اس لڑکے کی صلاحیت کو پہچانا لیکن اسے صرف انگریزی ہی نہیں، یورپی ادب بھی پڑھنے کا مشورہ دیا جس سے اچانک ڈوم کا ذہنی اور تخلیقی کینوس کافی وسیع ہوگیا۔ جب وہ انگلینڈ پہنچے تو ان کی نظمیں 'ان کاؤنٹر' جیسی عالمی شہرت یافتہ میگزین میں شائع ہوئیں اور ٹی ایس ایلیٹ، اوڈین اور اسٹیفن اسپنڈر جیسے بڑے شاعر ان کے خیر خواہ اور دوست بن گئے۔ جس طرح کبھی ملک راج آنند اپنے معاصر برطانوی قلم کاروں کے بیچ مقبول تھے، اسی طرح ان سے لگ بھگ 30 سال بعد ڈوم موریس کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ یہاں تک کہ مشہور مصور فرانسس بیکن بھی ان کے دوست تھے۔ ڈوم موریس کی خودنوشتوں کے مجموعہ 'اے ویرائٹی آف ایب سینسیز' کو پڑھنا بین الاقوامی شاعری، فن اور سیاست سے گزرنا ہے۔

ڈوم موریس کا رنگ لگ بھگ آبنوسی تھا لیکن ان کی روح اور تخلیقیت 'انگلش' تھی۔ رفتہ رفتہ انھوں نے محسوس کیا کہ اپنی ذہنی سطح کے سماج میں تو ان کا احترام تھا لیکن اس کے باہر عام گورے انھیں عام 'کالا' ہی سمجھتے تھے اور ویسا ہی سلوک بھی کرتے تھے۔ اپنے والد کے ساتھ بچپن میں ہی بیرون ملک کا سفر کرنے والے ڈوم خود کو آخر آخر تک ایک ایسا شخص سمجھتے رہے جو کسی ملک کا نہیں ہے۔ وہ کبھی کانگو میں رہائش اختیار کرنا چاہتے تھے لیکن بالآخر انھیں واپس آکر ہندستان میں ہی بسنا پڑا۔

ان کے چھوٹے بڑے 8 مجموعے شائع ہوئے جن میں 'پوئمس: 1955-65' اور 'کلکٹیڈ پوئمس: 1958-87' شامل ہیں۔ آخری مجموعہ 'ٹائپڈ وِتھ وَن فنگر' پچھلے سال آیا تھا۔ لیکن خود انھوں نے لکھا ہے کہ محض شاعری سے گزربسر نہیں ہوسکتا اس لیے انھوں نے سرگذشت اور ہندستانی صوبوں، جہاز رانی وغیرہ پر کتابیں لکھ کر یا ان کی ایڈیٹنگ کر کے کام چلایا۔ انھوں نے اندرا گاندھی کے عرصۂ حیات میں ہی ان کا ایک سوانحی خاکہ 'مسز گاندھی' لکھا جو نجی ملاقاتوں پر مبنی ہے۔

ڈوم نے ٹیلی ویژن کے لیے ہندستان 'کیوبا' اسرائیل اور برطانیہ پر 20 سے زیادہ ڈاکیومینٹری فلم بنائی۔ انھوں نے اقوام متحدہ کے لیے بھی کام کیا تھا، دنیا بھر کا دورہ کیا تھا اور کئی اخباروں اور رسالوں کے لیے صحافتی خدمات انجام دی تھیں۔

ڈوم انتہائی خاموش طبع انسان تھے، لیکن انھوں نے اپنی خودنوشتوں میں اپنا پردہ فاش کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں برتی۔ دراصل وہ ہندستانی انگریزی کے پہلے 'کنفیشنل' شاعر ہیں جس میں خوشی، غم، زندگی، موت کے کئی رنگ ہیں۔ اپنی نظم 'فنگرس ان دی لینڈ اسکیپ' کے آغاز میں وہ کہتے ہیں —

'ڈائنگ از جسٹ دی سیم ایز گوئنگ ٹو سلیپ'۔

اس کا لحاظ رکھ کر موت انھیں نیند میں ہی آگئی!

(بشکریہ "اردو نامہ"، پٹنہ، 13 جون 2004)

□□□

تحریر: گابریل گارسیا مارکیز
ترجمہ: فیاض احمد

# بڑے بڑے پنکھوں والا ایک بوڑھا

آج بارش کا تیسرا دن تھا، آنگن میں اب بھی پانی بھرا ہوا تھا، گھر کے اندر کیکڑوں کی فوج اکٹھی ہو چکی تھی، گھر کے لوگوں نے ڈھیر سارے کیکڑے مارے لیکن ان کی تعداد اتنی تھی کہ انھیں پھینکنے کے لیے پلایو کو سمندر کا رخ کرنا پڑا۔ جب نوزائیدہ بچہ رات بھر بخار سے تپتا رہا تب لوگوں نے سوچا کہ شاید یہ مرے ہوئے کیکڑوں کے تعفن کے سبب بیمار ہوا ہے۔ منگل سے ہی سارا عالم سوگوار تھا۔ سمندر اور آسمان دونوں مٹیالے لگ رہے تھے۔ سمندر کے کنارے ریت، جو مارچ کے مہینے میں مدھم روشنی سے جھلملا اٹھتی تھی، کیچڑ میں تبدیل ہو چکی تھی اور وہاں سے سڑی مچھلیوں کی بو آرہی تھی۔ دوپہر میں جب پلایو کیکڑے پھینک کر گھر لوٹا تو سورج کی روشنی ماند پڑ چکی تھی، اس نے دیکھا کہ آنگن کے ایک گوشے میں کچھ ہلچل سی تھی اور وہاں سے کراہنے کی آواز بھی آرہی تھی۔ وہ قریب پہنچا، سامنے ایک بوڑھا کیچڑ میں دھنسا پڑا تھا، اوندھے منہ لگتا تھا جیسے اس بوڑھے نے کھڑے ہونے کی بہت کوشش کی ہو لیکن وہ اٹھ نہیں پایا کیونکہ اس کے بڑے بڑے پنکھ تھے۔

پلایو سہم گیا اور اپنی بیوی ایلی سنڈا کو بلانے گھر کے اندر بھاگا۔ وہ اپنے بیمار بچے کی مالش کر رہی تھی۔ پلایو اسے لے کر آنگن میں آیا۔ دونوں نے بے حس و حرکت بوڑھے جسم کو دیکھا۔ کپڑوں سے وہ کوئی کوڑا چننے والا لگ رہا تھا، اس کی گنجی کھوپڑی پر اکا دکا بے رنگ بال نظر آرہے تھے۔ اس کے منہ میں دانت بھی بہت کم تھے، اس کی حالت کچھ ایسی قابلِ رحم تھی کہ اس کو دیکھ کر لگتا نہیں تھا کہ اس کا ماضی کبھی اچھا رہا ہوگا یا اس نے کبھی شان و شوکت کی زندگی گزاری ہوگی۔ اس کے بڑے بڑے شکروں جیسے پنکھ جو کیچڑ میں آلودہ اور نیم شکستہ تھے۔ پلایو اور ایلی سنڈا اسے اتنے قریب سے اتنی دیر تک تعجب بھری نظروں سے گھورتے رہے کہ انھیں یہ شخص جانا پہچانا سا لگنے لگا اور دونوں اس سے بات کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ لیکن جب اس نے عجیب و غریب انداز سے سمندری سیاح کے لہجے میں جواب دیا تو وہ اس کے پنکھوں کو بھول گئے جن کی وجہ سے اسے دشواری ہو رہی تھی اور فوراً یہ تسلیم کر لیا کہ وہ ایک غیر ملکی جہاز کا مسافر ہے جو سمندری طوفان کی زد میں آگیا ہے۔ تاہم دونوں نے اپنی ایک پڑوسن کو آواز دے کر بلایا، یہ عورت زندگی اور موت کے بارے میں سب کچھ جانتی تھی۔ اس نے پلایو اور ایلی سنڈا کی غلط فہمی فوراً دور کی اور کہا: یہ ایک فرشتہ ہے اور یقیناً بچے کی خاطر یہاں آیا ہوگا لیکن بے چارہ اتنا بوڑھا ہے کہ مسلسل بارش کی مار نہیں جھیل سکا۔

اگلے دن ہر شخص کو پتہ چل گیا کہ انسان نما ایک فرشتہ پلایو کے گھر میں قید ہے۔ پڑوس کی عاقلہ بوا کا خیال تھا کہ کسی آسمانی سازش کی وجہ سے ان دنوں فرشتوں کو جنت سے باہر نکالا جا رہا تھا اور اسی لیے اس فرشتے کو بھی کچل کر مار ڈالنا چاہیے لیکن کسی میں ہمت نہیں ہوئی۔ پلایو اسے پوری دوپہر اپنے باورچی خانے سے مسلسل دیکھتا رہا — ہاتھ میں ڈنڈا لیے۔ بستر پر جانے سے پہلے اس نے فرشتے کو کھینچ کر کیچڑ سے نکالا اور مرغی کے ڈربے میں بند کر دیا۔ آدھی رات کو جب بارش تھم چکی تھی، پلایو اور ایلی سنڈا کیکڑوں کو مارنے میں مصروف تھے۔ تھوڑی دیر بعد بچہ نیند سے بیدار ہوا، اس کا بخار اتر چکا تھا، اسے بھوک بھی لگ رہی تھی۔ یہ دیکھ کر انھیں احساس ہوا کہ یہ سب اس فرشتے کی وجہ سے ہوا ہے اس لیے انھوں نے طے کیا کہ اسے لٹھوں کے ٹھاٹھ میں رکھ دیا جائے اور کھانا پانی دے کر قسمت کے سہارے سمندر کے کنارے تین دن تک چھوڑ دیا جائے، لیکن اگلی صبح پو پھٹتے ہی جب دونوں آنگن میں گئے تو دیکھا کہ پڑوس کے سارے لوگ ڈربے کے پاس جمع ہیں اور اس بوڑھے کے ساتھ بڑے بھدے انداز میں ٹھٹھولی کر رہے ہیں، کھانے کی چیزیں اس کی طرف ایسے پھینک رہے تھے گویا وہ فرشتہ نہیں بلکہ سرکس کا کوئی جانور ہو۔

فادر گونزاگا صبح سات بجے سے پہلے ہی آگئے کیونکہ اس خبر نے انھیں پریشان کر دیا تھا۔ اس دوران ایسے تماشائی بھی آچکے تھے جو صبح آنے والوں کے مقابلے میں زیادہ مہذب تھے۔ وہ قیدی کے مستقبل کے بارے میں طرح طرح کی قیاس آرائیاں کر رہے تھے۔ عام رائے تو یہ تھی کہ اس فرشتے کو دنیا کا میئر بنا دینا چاہیے۔ دوسری جانب سخت گیر قسم کے لوگوں کا خیال تھا کہ اسے ترقی دے کر پانچ ستاروں والے جنرل کا عہدہ دینا چاہیے تاکہ ساری جنگ جیتی جا سکے۔ جو دور اندیش تھے ان کا خیال تھا کہ اسے افزائشِ نسل کے لیے رکھ لینا چاہیے تاکہ دنیا میں پنکھ والے عقلمندوں کا راج ہو جائے۔ فادر گونزاگا پادری بننے سے پہلے ایک جی دار لکڑہارے تھے۔ انھوں نے ڈربے کے پاس کھڑے کھڑے اپنے عقیدے کا حساب کتاب کیا اور ڈربے کا دروازہ کھولنے کے لیے کہا تاکہ اس قابلِ رحم شخص کو غور سے دیکھ سکیں جو مست چوزوں کے

درمیان خستہ حال مرغی کے مانند لگ رہا تھا۔ وہ ایک گوشے میں لیٹا تھا اور اپنے پروں کو دھوپ میں سکھا رہا تھا۔ اس کے اردگرد پھلوں کے چھلکے اور کھانے پینے کی چیزیں بکھری تھیں جنھیں صبح آنے والے پھینک گئے تھے۔ جب فادر گونزاگا مرغیوں کے ڈربے میں داخل ہوئے اور اسے لاطینی زبان میں صبح بخیر کہا تو دنیا کی گستاخیوں سے بے نیاز اس نے صرف اپنی آنکھیں کھولیں اور اپنی زبان میں کچھ بڑبڑایا۔ ارے! یہ نہ تو خدائی زبان سمجھتا ہے اور نہ ہی اسے یہ معلوم ہے کہ کسی پادری کا استقبال کیسے کرنا چاہیے۔ یہ ضرور نقلی فرشتہ ہے، فادر نے سوچا۔ پھر انھوں نے محسوس کیا کہ وہ انسانوں سے بہت زیادہ مماثلت رکھتا ہے، اس کے جسم سے ناقابلِ برداشت بو آرہی تھی، اس کے پروں کے پچھلے حصے میں کیڑے پڑے تھے اور اس کے رووں پر اس زمین کی ہوا نے بہت برا اثر کیا تھا۔ اس میں فرشتوں جیسی کوئی بات نہیں رہ گئی تھی۔ فادر گونزاگا مرغی کے ڈربے سے باہر نکلے اور ایک مختصر سا خطبہ دے ڈالا۔ انھوں نے تنبیہ کی کہ لوگوں کو سادہ لوحی سے کام نہیں لینا چاہیے کیونکہ شیطان بھولے بھالے لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے طرح طرح کے بھیس بدل لیتا ہے۔ انھوں نے دلیل دی کہ جس طرح گدھ اور ہوائی جہاز میں امتیاز کرنے کے لیے صرف پنکھ کافی نہیں اسی طرح فرشتوں کو بھی پہچاننے کے لیے پنکھ کافی نہیں۔ پھر بھی انھوں نے وعدہ کیا کہ وہ اس بابت اپنے بشپ کو لکھیں گے تاکہ وہ اپنے سے بڑے پادری کو لکھے۔ بڑا پادری پاپائے روم کو لکھے گا تاکہ عدالتِ عالیہ سے اس سلسلے میں کوئی فیصلہ ہو سکے۔

فرشتے کی خبر اتنی سرعت سے پھیلی کہ چند گھنٹوں میں آنگن میں بازار جیسا ہنگامہ ہو گیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے ہجوم پورے گھر کو تہس نہس کر ڈالے گا۔ بانجھ دلوں پر ان اقوالِ زریں کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ لوگوں کو منتشر کرنے کے لیے سنگینوں سے لیس سپاہی بلانے پڑے۔ ایلی سنڈا کو جس کی کمر صفائی کرتے کرتے دوہری ہو گئی تھی، ایک تدبیر سوجھی کہ کیوں نہ آنگن کے احاطے کو خاردار تاروں سے گھیر دیا جائے اور فرشتے پر ٹکٹ لگا دیا جائے۔ پانچ سینٹ کا ٹکٹ۔

فرشتے کو دیکھنے کے خواہشمند لوگ دور دور سے آنے لگے، ایک گشتی میلہ بھی وہاں پہنچ گیا جس میں ایک اڑنے والا بازی گر تھا۔ بار بار اڑان بھر کر بازی گر نے بھیڑ کو متوجہ کرنے کی کوشش کی لیکن کسی نے دھیان نہیں دیا کیونکہ اس کا پنکھ فرشتوں جیسا نہیں بلکہ چمگادڑ جیسا تھا۔ طرح طرح کی بیماریوں سے نڈھال لوگ بھی شفا حاصل کرنے کی غرض سے آگئے تھے۔ ایک بوڑھی عورت نے جو بچپن سے اپنی دھڑکنیں گن رہی تھی اور زندگی کے آخری دور میں پہنچ چکی تھی وہ بھی فرشتے کو دیکھنے آئی تھی۔ ایک پرتگالی بھی تھا جو رات میں اس لیے سو نہیں پاتا تھا کہ اسے ستاروں کے چلنے کی آواز سے پریشانی ہوتی تھی۔ ایک ایسا آدمی بھی تھا جو نیند میں چلتا تھا وہ دن میں جو کچھ کرتا رات کو اٹھ کر ان کو الٹ دیتا تھا۔ بہت لوگ ایسے بھی تھے جنھیں چھوٹی چھوٹی بیماریاں تھیں۔ پورا سماں ایسا تھا جیسے کسی جہاز کی تباہی سے زمین کانپ گئی ہو۔ پلایو اور ایلی سنڈا بری طرح تھک گئے تھے مگر خوش تھے کیونکہ ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا تھا اور ان کا گھر پیسوں سے بھر گیا تھا۔ زائرین کا سلسلہ ہنوز جاری تھا، لوگ قطار میں کھڑے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے جہاں تک نظر جاتی آدمی ہی آدمی دکھائی دے رہے تھے۔

بس ایک فرشتہ جو اپنے ہی لگائے میلے سے بے نیاز تھا۔ سارا سارا دن وہ اسی کوشش میں لگا رہتا کہ اس گھونسلے میں تھوڑا سکون مل جائے جو اس کا اپنا نہیں تھا۔ خاردار تار کے کنارے تیل کے دیے اور متبرک موم بتیاں روشن تھیں جن کی گرمی سے وہ حواس باختہ تھا، سب سے پہلے لوگوں نے اسے فینائل کی گولیاں کھلانے کی کوشش کی کیونکہ پڑوس کی عاقلہ بوا کا خیال تھا کہ فرشتوں کو کھانے کے لیے یہی دیا جاتا ہے لیکن اس نے کھانے سے انکار کر دیا، ٹھیک ویسے ہی جیسے اس نے تبرک کھانے سے انکار کر دیا تھا۔ یہ تبرک ایسے لوگ لائے تھے جو اپنے گناہوں سے توبہ کرنا چاہتے تھے۔ فرشتے نے کھانے کے نام پر صرف مشروم کھایا۔ ایسا اس نے کیوں کیا۔ فرشتہ ہونے کی وجہ سے یا پھر ایک معمر آدمی ہونے کی وجہ سے۔ یہ لوگوں کی سمجھ میں نہیں آیا۔ اس میں فرشتوں کی کوئی صفت نہیں تھی سوائے اس کے صبر و تحمل کے۔ خصوصاً شروع کے دنوں میں اس کا صبر دیکھنے کے لائق تھا۔ مرغیاں کیڑوں مکوڑوں کی تلاش میں اس کے پروں پر چونچ مارتیں، لنگڑے لولے اس کے پنکھوں کو اپنے جسم کے بیمار حصوں سے رگڑتے تاکہ وہ اچھے ہو جائیں اور جن لوگوں کو سب سے رحم دل سمجھا جاتا تھا وہ بھی اس پر پتھر پھینکتے تاکہ وہ کھڑا ہو اور لوگ اسے اچھی طرح دیکھ سکیں۔ لوگ اسے کھڑا کرنے میں صرف اس وقت کامیاب ہوئے تھے جب انھوں نے گرم لوہے کی چھڑ سے اس کے پنکھوں کو داغا تھا۔ دراصل وہ اتنی دیر تک بے حس و حرکت پڑا رہا تھا کہ لوگوں نے سمجھا کہ وہ مر گیا۔ اس وقت وہ بدک کر اٹھا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو آگئے تھے۔ وہ اپنی زبان میں کچھ بڑبڑایا اور اس نے اپنے پروں کو متعدد بار پھڑ پھڑایا، پنکھ پھڑ پھڑاتے ہی ایسا لگا جیسے دھول گرد اور مرغیوں کی بیٹ سے بھری کوئی قیمتی آندھی چل پڑی ہو۔ سب ہکا بکا رہ گئے۔ حالانکہ لوگوں نے سوچا کہ ایسا اس نے غصے میں نہیں بلکہ تکلیف میں کیا تھا، اس بات کا خیال رکھا جانے لگا کہ اب اسے کوئی پریشان نہ کرے۔ دراصل اس کی چپی کسی ہیرو کی چپی نہیں تھی جو محض ستانے کے لیے چپ ہو گیا ہو۔ اس کی خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ تھی۔ زیادہ تر لوگ یہی سمجھ رہے تھے۔

فادر گونزاگا کو قیدی کے متعلق آخری فیصلے کا انتظار تھا اور اس درمیان انھوں نے بھیڑ کو بیہودگی سے روکا تھا دوسری طرف روم نے اس سلسلے میں فوری توجہ کی ضرورت محسوس نہیں کی، ان لوگوں نے سارا وقت یہ معلوم کرنے میں گزار دیا کہ کیا قیدی کو ناف ہے؟ کیا اس کے اور آرمیائی زبان میں کوئی نسبت ہے؟ کتنی بار وہ سر جھکا سکتا ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ ناروے کا باشندہ ہے جس کے پر نکل آئے؟ اس طرح کی بے معنی باتوں کا سلسلہ جانے کب تک جاری رہتا مگر خوش قسمتی سے ایسی واردات ہوئی کہ پادری کو ان تمام مشکلات سے نجات مل گئی۔

ہوا یوں کہ کارنیوال کے موقعے پر شہر میں مختلف پروگرام منعقد کیے گئے، ان نمائشوں میں ایک ایسی عورت بھی شامل تھی جو اپنے والدین کی نافرمانی کی وجہ سے مکڑی میں تبدیل ہوگئی تھی، اسے دیکھنے کی فیس فرشتے کو دیکھنے کی فیس سے کم نہیں تھی لیکن لوگوں کو اس عورت کے بارے میں ہر قسم کا سوال کرنے کی اجازت تھی اور اس بات کی بھی چھوٹ تھی کہ اس عورت کا سر سے پاؤں تک جائزہ لیا جاسکے تاکہ کسی شک کی کوئی گنجائش نہ رہے۔ وہ ایک خوفناک مکڑی تھی جس کا قد مینڈھے جتنا تھا اور سر ایک افسردہ دوشیزہ جیسا تھا، اس کی حیرت انگیز وضع قطع اتنی کربناک نہیں تھی جس قدر وہ رنج و الم تھا جس کے ساتھ وہ اپنی بدنصیبی کی داستان سناتی تھی۔ جب وہ بچی تھی تو اپنے والدین کی نظروں سے بچ کر چپ چاپ گھر سے نکل گئی تھی اور جب بغیر اجازت رات بھر رقص کرنے کے بعد جنگلوں کے راستے گھر لوٹ رہی تھی تو ایک دہشت انگیز بجلی کی کڑک سے آسمان میں شگاف پڑ گئے اور جہنم کے شعلوں جیسی ایک چمک پیدا ہوئی جس نے اسے مکڑی بنا دیا۔ پھر اس کے بعد گوشت کے ٹکڑے اس کی غذا بن گئے جنھیں نیک روحیں اس کے منھ میں ڈال دیتی تھیں۔

اس کہانی میں ایک مانوس سی سچائی تھی اور عبرت تھی۔ اس کے آگے فرشتے کی کہانی یونہی سی لگنے لگی کیونکہ فرشتہ تو جانداروں کی طرف دیکھتا بھی نہیں تھا۔ فرشتے کے نام سے جو تھوڑے بہت معجزے منسوب تھے وہ ایک خاص قسم کی ذہنی بیماری کی نشاندہی کرتے تھے مثلاً کہا جاتا تھا کہ ایک اندھا شخص جو بینائی حاصل نہیں کرسکا اسے تین نئے دانت نکل آئے۔ ایک فالج زدہ شخص تھا جو چلنے میں کامیاب نہیں ہو پایا لیکن اس نے لاٹری جیت لی، اور ایک کوڑھی کے زخم سے سورج مکھی کے پھول پھوٹ پڑے۔ یہ باتیں معجزہ کم اور مذاق زیادہ لگتی تھیں اور انھیں باتوں کی وجہ سے فرشتے کی شہرت خاک میں مل گئی تھی۔ رہی سہی کسر مکڑی نما عورت نے پوری کردی اور لوگوں کی توجہ کا مرکز وہ عورت بن گئی جو مکڑی جیسی تھی۔ اس طرح فادر گونزاگا کو بے خوابی سے ہمیشہ کے لیے نجات مل گئی اور پلایو کا آنگن ویسے ہی سونا ہوگیا جیسے ان دنوں تھا جب مسلسل تین روز تک بارش ہوتی رہی تھی اور کیکڑے اس کے خواب گاہ میں گھس آئے تھے۔

پلایو اور ایلی سنڈا کے پاس افسوس کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی، جو پیسے انھوں نے جمع کیے تھے اس سے دو منزلہ عمارت کھڑی کر لی تھی۔ عمارت میں بالکونی، باغ سب کچھ تھا۔ عمارت کے اردگرد جالیاں لگا دی گئی تھیں تاکہ بارش کے دنوں میں کیکڑے نہ گھس پائیں، کھڑکیوں میں آہنی سلاخیں نصب تھیں تاکہ فرشتے گھر کے اندر نہ داخل ہوسکیں، شہر کے قریب پلایو نے خرگوشوں کے لیے گڑھے کھدوا دیے۔ پلایو نے زمیندار کی نوکری چھوڑ دی، ایلی سنڈا نے بھی کچھ اونچی ایڑیوں والی جوتیاں اور ایسے بہت سے رنگ برنگے سلک کے لباس خرید لیے جنھیں ان دنوں فیشن پرست عورتیں اتوار کے دن پہنتی تھیں، لیکن مرغیوں کے ڈربے پر کسی نے کوئی توجہ نہیں دی۔ اگر کبھی صفائی ہوتی اور اگر بتیاں جلائی جاتیں تو فرشتے کی عقیدت میں نہیں بلکہ مرغیوں کی بیٹ سے ہونے والی بدبو دور کرنے کے لیے، جو ایک بھوت کے مانند اب بھی ہر طرف موجود تھی۔ اس کی وجہ سے نیا گھر پرانا لگنے لگا تھا۔ ابتدا میں جب بچے نے چلنا سیکھا تو وہ دونوں بہت محتاط رہتے کہ بچہ ڈربے کے قریب نہ پہنچ جائے لیکن کچھ دنوں بعد ان کا خوف جاتا رہا اور وہ اس بدبو کے عادی ہوگئے۔ دوسرا دانت نکلنے سے پہلے بچہ کھیلنے کے لیے ڈربے کے اندر پہنچ گیا۔ وہاں تار ادھر ادھر گرے ہوئے تھے، فرشتہ بچے کے ساتھ بھی ویسے ہی بے رخی سے پیش آیا جیسے وہ دوسرے جانداروں کے ساتھ پیش آتا تھا لیکن اس نے حد درجہ صبر کا ثبوت دیا اور وہ تمام ذلت و رسوائی کو ایک ایسے کتے کی طرح برداشت کرتا رہا جسے اپنے بارے میں کوئی وہم و گمان نہیں ہو۔ فرشتہ اور بچہ دونوں کو ایک ساتھ چیچک ہوگئی، ڈاکٹر جو ان دونوں کے معائنہ کے لیے آیا خود کو فرشتے کی نبض ٹٹولنے سے روک نہیں پایا، اس نے فرشتے کے دل اور گردے میں ایسی ایسی آوازیں سنی کہ اسے فرشتے کا زندہ رہنا بالکل ناممکن لگا، فرشتے کے پنکھ دیکھ کر اسے سب زیادہ حیرانی ہوئی۔ وہ انسانی جسم پر بالکل فطری لگ رہے تھے۔ ڈاکٹر یہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا کہ دوسرے آدمیوں کو بھی ایسے پنکھ کیوں نہیں ہوتے۔

بچہ اسکول جانے لگا تھا۔ بارش اور دھوپ کی وجہ سے مرغی کا ڈربہ منہدم ہوئے کچھ ہی دن ہوئے تھے۔ فرشتہ ایک ایسے شخص کی طرح ادھر ادھر گھسٹ رہا تھا جو مرنے کے قریب ہو، لوگ جھاڑو مار کر اسے بیڈروم سے نکال دیتے اور تھوڑی دیر بعد ہی وہ باورچی خانے میں پایا جاتا۔ ایک ہی وقت میں وہ اتنی جگہوں پر پایا جاتا کہ لوگ یہ سوچنے پر مجبور ہوگئے کہ اس کے بہت سارے ہم شکل ہیں جنھیں وہ خود ہی پورے گھر میں جن رہا تھا، یہ دیکھ کر ایلی سنڈا کو بہت غصہ آتا اور وہ زور زور سے چیخنے لگتی کہ وہ فرشتوں سے بھرے اس جہنم میں رہ

ہی نہیں سکتی۔ فرشتہ شاذ و نادر ہی کھانا کھاتا اور اس کی بوڑھی آنکھیں اتنی دھندلی ہوگئی تھیں کہ وہ چلتے چلتے کھمبوں سے ٹکرا جاتا، پنکھوں کے نام پر بس ٹھنٹھ بچے تھے۔ پلایو نے اس پر ایک کمبل ڈال دیا تھا اور اتنی مہربانی کی کہ اسے چھپّر کے نیچے سونے سے منع نہیں کیا اور تب لوگوں کو پتہ چلا کہ اسے رات بھر بخار تھا اور وہ ہذیان میں کسی ٹیڑھی میڑھی زبان میں بڑبڑا رہا تھا۔ پلایو اور ایلی سنڈا بدحواس ہوگئے کیونکہ انھیں لگا کہ فرشتہ اب بچے گا نہیں۔ پڑوس کی عاقلہ بوا کو بھی یہ نہیں معلوم تھا کہ مردہ فرشتوں کے ساتھ کیا کیا جاتا ہے۔

لیکن وہ نہ صرف اپنی زندگی کی سب سے بری سردی جھیل گیا بلکہ دھوپ کے ساتھ ساتھ اس کی حالت میں سدھار بھی نظر آنے لگا۔ وہ کئی روز تک آنگن کے ایک گوشے میں بے حس و حرکت پڑا رہا تاکہ کوئی اسے دیکھے نہیں۔ دسمبر کے شروع میں اس کے بازوؤں پر کچھ بڑے بڑے سخت پر نکلنے لگے، بجو کی طرح کے پر جو اس کی خستہ حالی کی داستان سنا رہے تھے۔ وہ ضرور ان تبدیلیوں کی وجہ جانتا ہوگا کیونکہ وہ بہت محتاط رہتا تھا کہ کوئی ان پنکھوں کو دیکھ نہ لے، وہ کبھی کبھی تاروں کے سائے میں بیٹھ کر ملاحوں کے گیت گاتا۔ ایک دن صبح سویرے ایلی سنڈا دوپہر کے کھانے کے لیے پیاز کاٹ رہی تھی تبھی اسے لگا کہ سمندری ہوا کا ایک جھونکا باورچی خانے میں گھس آیا، وہ اٹھ کر کھڑکی کے پاس گئی، باہر فرشتہ اڑنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ وہ اڑ کر چھپّر پر پہنچ جاتا لیکن بار بار پھسل جا رہا تھا اور ہوا کو اپنی گرفت میں نہیں لے پا رہا تھا۔ پھر کسی طرح وہ اڑنے میں کامیاب ہوگیا۔ ایلی سنڈا نے اس کے لیے اور خود اپنے لیے راحت کی سانس لی جب اس نے اسے آخری گھر کے اوپر سے کسی کمزور گدھ کی طرح پنکھ پھڑپھڑا کر جاتے دیکھا، وہ اسے دیکھتی رہی اور پیاز کاٹتی رہی وہ اسے اس وقت تک دیکھتی رہی جب تک کہ وہ آنکھوں سے اوجھل نہ ہوگیا۔ وہ اب ایلی سنڈا کے لیے وبالِ جان نہیں تھا بلکہ سمندری افق پر ایک خیالی نقطہ بن چکا تھا۔

□□□


## تحریکِ خلافت

### مصنف: قاضی محمد عدیل عباسی

ہندستان میں چلائی جانے والی تحریکِ خلافت نے بالواسطہ طور پر ہماری تحریکِ آزادی کو بھی ایک نئی قوت عطا کی تھی۔ اس کتاب میں مصنف نے جو اس تحریک میں شریک تھے، تحریکِ خلافت کے تمام پہلوؤں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

دوسرا ایڈیشن، ڈیمائی، 219 صفحات، قیمت 65.00 روپے

## تالستائے

### مصنف: ڈاکٹر محمد یٰسین

تالستائے کی تصانیف ہمیں خواب و خیال کی دنیا سے حقیقت کی طرف لے جاتی ہیں۔ اس کے یہاں حیات و کائنات کا عرفان بھی ہے اور عام انسانی جذبات و احساسات کی عکاسی بھی۔ اس کتاب میں تالستائے کے سوانحی گوشوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور اس کے فنی کارناموں پر بھی۔

دوسرا ایڈیشن، ڈیمائی، 152 صفحات، قیمت 46.00 روپے

## بابرنامہ

### تلخیص کار اور مترجم: ڈاکٹر محمد قاسم صدیقی

''تزکِ بابری'' کی تلخیص اور آسان اردو میں ترجمہ۔ یہ تلخیص ان حصوں پر مشتمل ہے جن میں بابر نے بہ طور خاص ہندستان کے رسم و رواج، یہاں کے موسموں، یہاں کی آب و ہوا یہاں کے پھلوں اور پھولوں کا ذکر کیا ہے۔ یہ کتاب بچوں کے لیے خصوصی دلچسپی کی حامل ہے۔

دوسرا ایڈیشن، ڈیمائی، 101 صفحات، قیمت 15.00 روپے

## برنارڈ شا

### مصنف: عبدالمغنی

جارج برنارڈ شا ایک روشن خیال اور انسان دوست ادیب اور مفکر تھا جو نسل یا قومیت کی حد بندیوں سے نکل کر پورے عالم انسانیت کی بہتری کا خواہاں تھا۔ اس کتاب میں برنارڈ شا کے شخصی اور ادبی اوصاف تفصیل سے بیان ہوئے ہیں۔

دوسرا ایڈیشن، ڈیمائی، 96 صفحات، قیمت 35.00 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسبِ ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

آغا مرزا محمود ہماری مطبوعات (''اردو اصناف (نظم ونثر) کی تدریس'' سے اقتباس)

# تدریسِ مرثیہ

مرثیہ اردو ادب کی آبرو اور سب سے قیمتی سرمایہ اور سب سے زیادہ جاندار صنف ہے۔ یہ صنف عالمی ادب میں ایپک (Epic) اور ڈرامے کے مقابلے میں پیش کی جاسکتی ہے ویسے مرثیہ نہ ایپک ہے نہ ڈراما۔ لیکن اس میں ایپک کی وسعت بھی ہے اور ڈرامے کی گہرائی بھی۔ مرثیہ نیم ڈرامائی نیم بیانیہ نظم ہے۔

''مرثیہ'' عربی کا لفظ ہے جو ایک اور لفظ ''رثٰی'' سے مشتق ہے۔ ''رثٰی'' کے معنی ہیں مُردے پر رونا اور آہ وزاری کرنا۔ مرثیوں کو ہم دو حصوں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔

(1) وہ مرثیے جو حضرت امام حسینؓ اور ان کے ساتھیوں کی شہادت اور کربلا کے دیگر واقعات پر مبنی ہیں۔

(2) وہ مرثیے جو مختلف مشاہیر قوم یا کسی عزیز کی موت پر لکھے جاتے ہیں۔ انھیں ''شخصی مرثیے'' کہتے ہیں۔

اردو میں شخصی مرثیے کہے گئے جیسے مولانا حالی کا مرثیۂ غالب ہے۔ ڈاکٹر اقبال نے ''والدہ مرحومہ کی یاد میں'' جو نظم کہی ہے وہ بھی بقول صالحہ عابد حسین اردو کے بہت عمدہ مرثیوں میں شمار کی جاسکتی ہے۔ اردو میں مرثیہ اس واقعہ سے مختص ہوگیا جس نے اسلامی دنیا میں تہلکا مچادیا۔ یعنی جو حضرت امام حسینؓ کی شہادت اور اہلِ بیت کے مصائب سے متعلق ہے۔ اردو مرثیہ کا سانچا خاص اردو زبان سے آیا ہے نہ یہ عربی سے آیا ہے نہ فارسی سے۔ اس کی مثال دوسری زبانوں میں نہیں ملتی۔ بقولِ ڈاکٹر سید حامد حسین اردو مرثیہ کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی اردو زبان کی تاریخ۔ سارے دکنی شعرا جیسے وجہی، غواصی، نصرتی، محمد قلی قطب شاہ نے مرثیے لکھے۔ دکنی دور کے مرثیے اردو شاعری کا اولین نمونہ بھی ہیں۔

شمالی ہند میں مرثیہ گوئی کا آغاز اٹھارھویں صدی کی ابتدا میں ہوتا ہے۔ ولی کا دیوان دلّی پہنچا۔ شمالی ہند میں دکنی مرثیے کی آمد شروع ہوگئی۔ سودا نے گو مربع میں مراثی کہے لیکن مسدس کی شکل میں سب سے پہلے سودا ہی نے مرثیے کہے۔ رفتہ رفتہ مسدس ہی مرثیہ کی مقبول شکل بن گئی۔ ڈاکٹر اسد اریب لکھتے ہیں کہ میر انیس کی مرثیہ نگاری میں جو نئے باب روشن ہوئے انھیں سودا نے ہی کھولا تھا۔ شاہان اودھ چونکہ شیعہ عقیدہ رکھتے تھے اس لیے اس زمانے میں مرثیہ گوئی کو فروغ حاصل ہوا۔ خلیق، ضمیر، انیس اور دبیر نے مرثیے میں درد کے اثر کو درجہ کمال تک پہنچا دیا۔ طویل مرثیے سودا کے عہد سے ہی شروع ہوگئے۔ چونکہ مرثیہ کا موضوع مجموعی طور پر ایک ہی تھا یعنی سانحۂ کربلا۔ بار بار ایک ہی واقعے کو دوہرانا پڑتا تھا اس لیے مرثیہ نگار وسعت دینے کے لیے اس واقعے کو مختلف زاویوں سے پیش کرنے لگے۔ چنانچہ امام حسینؓ کی مدینہ سے روانگی، مسلم بن عقیل اور ان کے بچوں کی کوفے میں شہادت، کربلا میں ورود، پھر شہادت، سفر شام، قید خانے کی صعوبتیں، پھر مدینہ کی واپسی تک کے واقعات پر الگ الگ مرثیے لکھے گئے۔ کربلا میں حضرت قاسم، علی اکبر، علی اصغر، عباس علمدار، عون ومحمد پر الگ الگ مراثی لکھے جانے لگے۔ ان مرثیوں میں ان اصحاب کی ذہنی کیفیات اور سراپا اور ان کے محسوسات بیان ہونے لگے۔ اہلِ بیت کے علاوہ امام حسینؓ کے اعوان و انصار جیسے حُر، حبیب ابن مظاہر، اور زہرا ابن قیس کو بھی مرثیوں میں جگہ دی گئی۔ صالحہ عابد حسین لکھتی ہیں کہ مرثیہ میں شہیدان کربلا کی سیرت اور شخصیت کو اُجاگر کرکے ان کو ایک طرف ادب کا کردار بنایا تو دوسری طرف پڑھنے اور سننے والوں سے ان کا مفصل تعارف کرانے کی رسم کی بنیاد ڈالی۔

میر ضمیر نے مرثیے کو معیاری پیکر دیا، اجزائے ترکیبی متعین کیے۔ مرثیہ ایک ترقی یافتہ صنف شاعری بن چکا ہے۔ انیس و دبیر نے اس سانچے کو قبول کیا اور اسے ایک اعلا اور آزاد صنف ادب کی آبرو دی۔ انیس نے فطرت انسانی، سادگی اور خلوص فن سے اردو مرثیہ کو لازوال نمونے عطا کیے تو دبیر نے اپنی فن کارانہ چابکدستی، زبان و بیان پر حیرت انگیز قدرت، موضوعات سے تنوع اور واقعات کی کثرت سے مرثیے کو نئی وسعت اور وقار دیا۔ انیس اور دبیر نے پہلی بار اردو شاعری کو ان جذبات و احساسات اور فطرت انسانی سے باعظمت پہلوؤں سے روشناس کیا جن کی غزل کے روایتی اسلوب بیان میں گنجائش نہیں نکلتی تھی۔ ان مراثی نے اردو شاعری کو اس کے خلاقانہ منصب سے آگاہ کیا۔ حق و باطل کی کشمکش، عزم و جاں سپاری، ایثار و محبت، پاکیزہ کردار کے موضوعات کے لیے وہ گنجائش پیدا کی جو اردو شاعری کی کسی دوسری صنف میں نہ نکل سکی۔ یہی نہیں مرثیہ نگاروں نے اردو شاعری کو اعلا بیانیہ خصوصیات سے بھی آشنا کیا۔ مرثیہ نگار نے جہاں واقعے کی ڈرامائی ترتیب کی ضرورت

● ادب کی تدریس ایک مشکل اور پیچیدہ کام ہے۔ ہر دور میں ادب کے تقاضے زندگی کے تقاضوں کے ساتھ بدل جاتے ہیں۔ ادب کی تدریس کے انداز بھی بدل جاتے ہیں، اس لیے بندھے ٹکے انداز میں ادب کی تدریس ممکن نہیں۔ ''اردو اصناف (نظم و نثر) کی تدریس'' اسی مقصد کے تحت تیار کی گئی ہے کہ طلبہ کی استعداد کے پیشِ نظر تدریس کا کام اس طرح انجام دیا جائے کہ اسباق دلچسپ اور بامعنی بن سکیں اور طلبہ مختلف اصنافِ ادب سے کماحقہٗ واقف ہوسکیں۔ یہ کتاب پروفیسر اومکار کول اور جناب مسعود سراج نے مرتب کی ہے۔ قومی اردو کونسل کی شائع کردہ 280 صفحات کی اس کتاب کی قیمت 88 روپے ہے۔ طالب علموں اور اساتذہ کو کونسل کی کتابوں پر 40% خصوصی رعایت بھی دی جاتی ہے۔

محسوس کیا وہیں اس نے کرداروں کے اقوال، افعال اور روابط، عمر، مرتبہ اور جنس کے لحاظ سے امتیاز کرنا سیکھا۔ منظر کشی، سراپا نگاری، تلوار اور گھوڑے کی تعریف میں اس نے بسا اوقات روایتی تخیل آفرینی سے کام لیا مگر اعلا المیہ تاثر پیدا کرنے کے لیے اس کو اپنی نفسیاتی بصیرت اور حقیقت نگاری سے کام لینا پڑا۔ انیس و دبیر نے اردو مرثیے کے ان سارے معنوی اور فنی امکانات کو دریافت کیا۔ انھیں وسعت دی اور انھیں ایک نئی شعری روایت کی حیثیت سے پختگی عطا کی۔ مرثیہ گویوں نے اپنی بے پناہ تخلیقی قوت سے اس محدود میدان کو نہایت وسیع و ہمہ گیر بنا دیا اور اس صنف کو اعلا اور عظیم شاعری کی صف میں لا کھڑا کیا۔ اس کے لیے انھوں نے انسانی رشتوں، جذبات و احساسات کی آفاقیت اور شعر کے جملہ محاسن کو ہر لحہ پیش نظر رکھا۔ یہ صنف محض رونے اور رلانے کے جذبے اور طرز اظہار تک محدود نہیں رہی۔

مرثیہ اردو شاعری کی ایسی واحد صنف ہے جو پوری طرح ایک خاص ثقافتی مزاج، عقیدہ اور سلسلۂ روایات کی آئینہ دار ہے۔ چنانچہ اس کا فروغ اس ثقافتی ماحول سے وابستہ رہا۔ شاہان اودھ کے زوال کے بعد انگریزوں کے عہد میں مرثیہ نگاری سرپرستی سے محروم ہوگئی۔ پھر بھی اسے لکھنؤ میں مرکزیت حاصل رہی غالباً اسی وجہ سے مرثیہ میں سماجی فضا عرب کے بجائے ہندستانی ہے اس پر لکھنؤ کی زبان و معاشرت کا گہرا اثر ہے رسم و رواج، ماحول، بول چال یہاں تک کہ توہمات تک ہندستانی ہیں۔ لکھنؤ کی زندگی میں جہاں ایک خاص قسم کی نفاست، نوک پلک اور تیکھا پن ہے وہاں ایک خاص قسم کا تکلف اور تصنع بھی موجود ہے۔ لیکن زبان اور محاورے کی وہ نوک پلک اور بول چال کا وہ تیکھا پن بھی پایا جاتا ہے جو لکھنوی معاشرت کی ایک صفت ہے۔

مرثیے میں مثنوی کا سا رنگ بھی ہے کہ اس میں ایک مسلسل داستان ملتی ہے۔ جس طرح مثنوی میں مختلف کردار ہوتے ہیں مرثیے میں بھی مختلف کردار ہوتے ہیں۔ وہ ایک شاندار المیے کے افراد ہیں خیر کے نمائندے ہیں اور شر سے برسر پیکار ہیں۔ یہ اوصاف ان میں مشترک ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی ذاتی خصوصیات ہیں جو انھیں ایک دوسرے سے متمیز کرتی ہیں۔ مثلاً امام حسینؑ کا علم وفضل اور حلم و بردباری، حضرت زینب کی اپنے بھائی سے بے حد محبت۔

مرثیہ میں ڈرامائی رزم و پیکار کے تمام عناصر بھی موجود ہیں۔ مختلف موقعوں پر افراد قصہ کے جذبات کا تجزیہ نہایت خوبی سے کیا گیا ہے۔ محمد احسن فاروقی نے اپنے مضمون ''مرثیہ نگاری اور انیس'' میں کہا ہے کہ ''انیس کا کمال یہ ہے کہ اس نے ہر صنف سخن کے مغز سے فائدہ اٹھا کر مرثیے کو ایک ایسی چیز بنا دیا ہے جس میں مثنوی، قصیدہ، غزل، ڈرامہ داستان سبھی چیزوں کا رنگ جھلکتا ہے اور اس کے باوجود اس صنف سخن کی انفرادیت قائم رہی ہے۔

وہ فضا جو مرثیہ کی خاص فضا تھی مٹ گئی۔ وہ ماحول نہ رہا جس میں مرثیہ پنپتا تھا اور وہ محرکات وعوامل نہ رہے۔ مرثیوں کا قدیم رنگ انیس، دبیر اور ان کے خانوادوں کے افراد کے ساتھ ختم ہوگیا لیکن مرثیہ بحیثیت صنف ختم نہیں ہوا۔ مرثیے کا سفر ان کے بعد بھی جاری رہا۔ جوش، نجم آفندی، نسیم امروہوی، جمیل مظہری، آل رضا، ڈاکٹر صفدر حسین اور آغا سکندر مہدی اور وحید اختر اس سلسلے کے نمایاں نام ہیں۔

ڈاکٹر اسد اریب اپنی تصنیف ''اردو مرثیہ کی سرگزشت'' میں لکھتے ہیں کہ ''تشکیل پاکستان کے بعد مجلسی تہذیب نے مرثیے کے درماندہ کارواں کو بہت ہی تیزی کے ساتھ آگے بڑھایا۔ میر انیس کو مرثیے کے فن کا فل اسٹاپ نہیں سمجھنا چاہیے۔'' پرانے مرثیے کا آخری اور نئے مرثیے کا ابتدائی سرا جس شخص کے ہاتھوں میں ہے۔ وہ اس عہد کا سب سے کہنہ مشق شاعر نجم آفندی ہے۔ نجم آفندی نے بیسویں صدی کے پہلے ربع میں مرثیے پر جو شعری تجربات کیے تھے۔ ان کے تجزیے سے نسل نو نے جی بھر کے فائدہ اٹھایا۔

جمیل مظہری نے اپنے مرثیے کو قدیم مرثیے سے قدرے جدا کر کے لکھا۔ انھوں نے اپنے مرثیے میں غزل کی زبان اور تغزل کے لب و لہجے کو نہایت عمدگی کے ساتھ برتا۔ آل رضا اور جمیل مظہری دونوں معاصر شعرا تھے۔ نسیم امروہی اردو مرثیے کی روایت میں ایک مضبوط کڑی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے نقلی اور عقلی دلائل کے ساتھ کربلا کے فلسفۂ شہادت کو آشکار کیا ہے۔ نجم اور جوش کے بعد مرثیے کے ممتاز شعرا کی صف میں کئی نام آتے ہیں ان نمایاں ناموں میں ایک نام ڈاکٹر صفدر حسین کا ہے۔

مرثیہ بھی اور اصناف کی طرح زندہ اور متحرک صنفِ سخن ہے۔ ہر عہد میں مرثیے نے بھی تبدیلیوں کو قبول کیا اور مسلسل ارتقا کا سفر طے کیا ہے۔ اب مرثیے کے اجزائے ترکیبی کی ہیئت پہلے جیسی نہیں رہی اب یہ بات پرانی ہوچکی ہے کہ مرثیہ صرف سانحہ کربلا سے متعلق مخصوص نظم کا نام ہے۔

## عناصر مرثیہ

میر ضمیر نے مرثیے کے حسب ذیل عناصر قائم کیے:

(1) چہرہ (2) سراپا (3) رخصت (4) آمد (5) رجز (6) رزم (7) شہادت (8) بین (9) دعا

## چہرہ:

چہرہ دراصل مرثیہ کی تمہید ہے۔ اس میں صبح کا منظر، رات کا سماں، گرمی کی شدت، سفر کی دشواریاں، حمد و منقبت، تشخص ذاتی کے احساس اور تعلّی وغیرہ کے مضامین بیان کیے جاتے ہیں:

یارب چمن نظم کو گلزار ارم کر
اے ابر کرم خشک زراعت پہ کرم کر
تو فیض کا مبدا ہے توجہ کوئی دم کر
گمنام کو اعجاز بیانوں میں رقم کر
جب تک یہ چمک مہر کے پرتو سے نہ جائے
اقلیم سخن میرے قلم رو سے نہ جائے

(انیس)

## سراپا:

اس میں مرثیے کے ہیرو کے قد وقامت اور خد وخال بیان کیے جاتے ہیں۔ اس کی روحانی اور باطنی خوبیوں کے ساتھ شکل وصورت کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

### حضرت عباس کا سراپا:

ماہ بنی ہاشم تو زمانے میں لقب تھا
کیا حسن تھا کیا زور تھا کیا حسب ونسب تھا
انداز سراپا اسد اللہ کا سب تھا
قد عباس کہ مشہور عرب تھا
گر جلوہ نما ہوتے تھے وہ خانۂ زیں پر
تو پاؤں لٹکتے ہوئے رہتے تھے زمیں پر

(انیس)

## رخصت:

حضرت امام حسینؑ کے خیمے سے جب کوئی بہادر میدان جنگ کی طرف کوچ کرتا ہے تو سب اہل خیمہ اسے بہ حسرت ویاس قوت ایمانی کے ساتھ رخصت کرتے ہیں۔ اس موقعے پر مختلف النوع جذبات پر مبنی جو اشعار کہے جاتے ہیں انھیں اصطلاحاً ''رخصت'' کہا جاتا ہے۔

### حضرت امام حسینؑ رخصت ہو رہے ہیں:

جب پڑھ چکے شہ بعد فریضہ کی دعائیں
فرمایا کہ رخصت کے لیے بیبیاں آئیں
چھاتی سے پھر اک بار سکینہ کو لگائیں
کچھ بانو بھی کہہ لیویں تو سر دینے کو جائیں
بیووں سے ملاقات کی فرصت نہ ملے گی
پھر عصر تلک بات کی مہلت نہ ملے گی

(انیس)

## آمد:

ہیرو کی میدان جنگ میں آمد اور ہیرو کے گھوڑے کی تعریف مرثیے کا ایک اور اہم جز ہے۔

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے
رن ایک طرف چرخ کہن کانپ رہا ہے
رستم کا بدن زیر کفن کانپ رہا ہے
ہر قصر سلاطین زمن کانپ رہا ہے
شمشیر بہ کف دیکھ کے حیدرؑ کے پسر کو
جبریل لرزتے ہیں سمیٹے ہوئے پر کو

(دبیر)

## رجز:

عرب میں رواج تھا کہ میدان جنگ میں جب حریفین ایک دوسرے کے آمنے سامنے اور آمادہ پیکار ہوتے تھے تو نبرد آزمائی سے قبل ایک دوسرے کو للکارتے تھے اور اپنی اپنی شجاعت، دلیری، قوت وعظمت کا نہایت طاقت اور جوش سے اظہار کرتے تھے۔ شعر میں اس موقعے کی تصویر کشی اور فریقین کے فخریہ اظہار کو ''رجز'' کہا جاتا ہے۔

دنیا ہو اک طرف تو لڑائی کو سر کروں
آئے غضب خدا کا اُدھر، رُخ جدھر کروں
بے جبرئیل کار قضا و قدر کروں
انگلی کے اک اشارے میں شق القمر کروں
طاقت اگر دکھاؤں رسالت مآب کی
رکھ دوں زمیں پہ چیر کے ڈھال آفتاب کی

(انیس)

## رزم:

رجز کے بعد جنگ کا منظر آتا ہے۔ شجاعت، طاقت اور حرب وضرب کے مضامین کو ڈرامائی انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ مرثیہ کا سب سے اہم اور عظیم الشان عنصر رزمیہ ہے۔ اس میں جنگ بہ تفصیل اور تمام جزئیات بیان کیے جاتے ہیں۔ شاعرانہ فکر، زور تخیل اور قوت اظہار کے شاہکار اسی حصے میں نظر آتے ہیں۔

اللہ رے زلزلہ کہ لرزتے تھے دشت و در
جنگل میں چھپتے پھرتے تھے ڈر ڈر کے جانور
جنات کانپ کانپ کے کہتے تھے الحذر
دنیا میں خاک اڑتی ہے، اب جائیں ہم کدھر
اندھیر ہے، اٹھی برکت اب جہان سے
لو مل گیا زمیں کا طبق آسمان سے

(انیس)

## شہادت:

جنگ کے منظر کی انتہا ہیرو کی شہادت پر ہوتی ہے۔ یہ وہ مقام ہے، مرثیے کا سامع جس کا شدت سے منتظر رہتا ہے اور اسے حاصل مجلس سمجھا جاتا ہے۔

شہادت کا بیان نہایت سادے پیرائے میں کیا جاتا ہے۔

حضرت امام حسینؑ لخت جگر کی حالت زار دیکھ کر فرماتے ہیں:

کیوں کھینچتے ہو پانو کو اے میرے گل عذار
کیوں ہاتھ اٹھا اٹھا کے پٹکتے ہو بار بار
آنکھیں تو کھول دو کہ مرا دل ہے بے قرار
بیٹا! تمھاری ماں کو تمھارا ہے انتظار

بہنیں کھڑی ہیں در پہ بڑے اشتیاق میں
اکبر! تمھاری ماں نہ جیے گی فراق میں

**بین:**

ہیرو کی شہادت کے بعد اس پر بین اور اظہار تاسف کے ساتھ مرثیہ خاتمے پر پہنچتا ہے۔ عموماً یہ مرثیے کا آخری حصہ ہوتا ہے اور رنج و الم کے جذبات کی عکاسی کے لحاظ سے نہایت پر اثر ہوتا ہے۔

حضرت امام حسینؑ کی شہادت پر بی بی زینب یوں بین کرتی ہیں:

بھیا مرا کوئی نہیں تم خوب ہو آگاہ
احمدؐ ہیں، نہ زہراؓ نہ حسنؑ ہیں نہ یداللہؑ
ڈھارس تھی بڑی آپ کی، اے سید ذی جاہ
چھوڑا مجھے جنگل میں یہ کیا قہر کیا آہ
چلتے ہوئے کچھ مجھ سے نہ فرما گئے بھائی
بہنا کو نجف تک بھی نہ پہنچا گئے بھائی

**دعا:**

خاتمہ کلام پر شاعر دعا کرتا ہے۔ اپنے مرثیے کو شفاعت اور بخشش کا ذریعہ بننے کی دعا کرتا ہے۔ کبھی مرثیہ گو اپنی جماعت کے فلاح و بہبود کے لیے دعا کرتا ہے:

خامے کو بس اب روک انیس جگر افگار
خالق سے دعا مانگ کہ اے ایزد غفار
زندہ رہیں دنیا میں شہ دیں کے عزادار
غیر از غم شہ، ان کو نہ غم ہو کوئی زنہار
آنکھوں سے مزار شہ دلگیر کو دیکھیں
اس سال میں بس روضۂ شبیر کو دیکھیں

## مرثیہ کی ادبی اہمیت:

سید محمد عقیل اپنی تصنیف ''مرثیے کی سماجیات'' میں لکھتے ہیں 'مرثیہ بہت دنوں تک صرف مذہبی چیز سمجھا جاتا رہا اور اس پر کسی طرح ادبی بحث کرنا سوء ادب تھا لیکن مرثیے پر باقاعدہ ادبی بحث کا آغاز شبلی نے ''موازنۂ انیس و دبیر'' لکھ کر کیا۔ شبلی نے مرثیے کو عقیدے کے حصار سے نکال کر اُسے تنقیدی ادب کے ایوان میں داخل کیا اور پھر مرثیے پر ادبی مباحث کا دروازہ کھل گیا۔''

مرثیہ کی ادبی قدر و قیمت متعین کرنے سے پہلے یہ بہت ضروری ہے کہ معتقدات سے بحث نہ کی جائے۔ صرف ادبی محاسن پر نظر رکھی جائے۔ مرثیہ کا بنیادی مقصد رلانا ہے۔ شیعوں کے عقیدہ کی رُو سے اہلِ بیت کے مصائب پر رونا غیر فطری بات بھی نہیں، رونے سے ہمدردی و محبت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں اور ان عظیم ہستیوں کی تقلید کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور ان پر ظلم کرنے والوں کی طرف سے غصہ و نفرت کے جذبات ابھرتے ہیں۔

مرثیوں میں انسانی فطرت کے سارے جذبات پائے جاتے ہیں۔ جیسے محبت و اخلاص، جرأت، ثابت قدمی، غیظ و غضب، حسد و نفرت، وفاداری، صبر و ایثار، نفس کشی، بے لوثی وغیرہ۔ مرثیوں میں ساری شعر کی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ محمد حسین آزاد، شبلی، امداد امام اثر وغیرہ نے مرثیوں کی ادبیت کو تسلیم کیا ہے۔ سید علی عباس حسینی فرماتے ہیں:

''اردو مراثی کی وسعت ان کے موضوعات کا تنوع، ان میں مضامین کی گونا گونی، ان کی اعلیٰ ترین اخلاقی تعلیم، ان میں بیان کردہ کردار اور سیرت اور ان کی بلندیوں اور پستیاں، ان میں مناظر فطرت کی گونا گوں رنگینیوں کے ذریعے اردو زبان میں ہزاروں تشبیہوں اور استعاروں کا اضافہ وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جو انھیں قابلِ فخر ادبی حیثیت دیتی ہیں۔

جوش نے مرثیہ کو احتجاجی شعور سے روشناس کیا۔ بقول ڈاکٹر عقیل رضوی ''حسین اور انقلاب'' کے ساتھ مرثیے کی سماجی ساخت میں ہندستان کی اس وقت کی سوسائٹی کی دھڑکنیں سنائی دینے لگتی ہیں۔''

بقول ڈاکٹر اسد اریب ''ہمارے خیالات کے نئے آفاق پر مرثیہ اب جدید زندگی کی روشن علامتوں، نئے سیاسی اور سماجی استعاروں اور دھنک کی خوش رنگ لہروں کا ایسا مرقع بن گیا ہے جو کہیں کہیں تو خود اردو نظم کے لیے بھی قابلِ رشک ہے۔ بالخصوص جوش، نجم آفندی اور ڈاکٹر صفدر حسین کے مسدس ''طلوع فکر''، ''فتح مبین'' اور ''جلوۂ تہذیب'' وغیرہ۔ ان نئے مرثیوں میں نمایاں تبدیلیاں یہ تھیں۔

(1) مرثیے کے چہرے کو منظر فطرت سے ہٹا کر عصر حاضر کے احوال و آثار سے مخصوص کر دیا۔

(2) مرثیے کی روایتی زبان میں ترمیم و اصلاح کی۔

(3) مربوط خیالات کو ایسی نظم بنا دیا جو اول تا آخر اپنے نفس مضمون (حسینی شہادت) سے ہم رنگ ہو۔ بکا اور بین (مصائب) کے لیے ایسے واقعات کا انتخاب کیا جو نتیجتاً اس عہد کے مظلوم و مجبور انسانی طبقوں میں حوصلہ مندی کا باعث بنے۔

جوش کا مرثیہ ''حسین اور انقلاب'' اور ان کی مسدس ''طلوع فکر'' مسدس کی روایت میں زور بیان، حسن معانی، اور شکوہ مضامین کے اعتبار سے ادب عالیہ میں شمار کیا جاتا ہے۔'' (ڈاکٹر اسد اریب)

نجم آفندی نے قدیم لب و لہجے سے بغاوت بھی کی ہے۔

جس نے امور خیر کو بخشی حیات نو
جس کی نوائے درد میں ہے زندگی کی رو
جو سو گیا بڑھا کے چراغ وفا کی لو
صدیوں سے جس کے نقش قدم دے رہے ہیں ضو
بدلی عمل کی شکل ارادے بدل دیے
جس نے مطالبات کے جادے بدل دیے

**سلام:**

سلام مرثیے کے غزلیہ اسلوب کا نام ہے۔ مرثیہ ہمیشہ تحت اللفظ پڑھا جاتا ہے اور پڑھنے کا مقام منبر ہے۔ مگر سلام کے لیے منبر ضروری نہیں۔ وہ تکیوں کے سہارے بیٹھ کر فرشِ مجلس پڑھا جاتا ہے۔ سلام کی تکنیک اور ہیئت (Form) وہی ہے جو غزل کی ہے۔ پہلے مطلع ہوتا ہے قافیہ اور ردیف کا التزام کیا جاتا ہے مقطع کا اہتمام ہوتا ہے۔ جس طرح غزل کا ہر شعر اپنے اندر ایک الگ مفہوم رکھتا ہے اسی طرح سلام کے اشعار بھی الگ تھلگ رہ سکتے ہیں۔ غزل کا انداز رمز و کنایہ اس کا ایک وصف ہے۔ یہی کیفیت سلام میں ہوتی ہے۔ جس طرح غزل کے مطلع میں شاعر تعلّی کرتا ہے فخر و مباہات سے کام لیتا ہے اسی طرح سلام میں کام لیتا ہے۔

لگا رہا ہوں مضامین نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو
(انیس)

مجموعی حیثیت سے اس کی فضا پاکیزہ خیالات، تزکیہ نفس کے جذبات ناپائداری حیات کے اظہار اور اتباع سیرت معصومینؑ سے معمور ہوتی ہے۔

لکھنؤ کے مرثیہ گو شاعر ہی سلام کے بھی موجد ہیں۔ میر ضمیر، دلگیر، میر انیس، دبیر کے علاوہ بہت سے شعرا نے سلام لکھے۔ دور جدید میں بھی اس صنف نے کافی ترقی کی ہے۔ ذیل میں دبیر کا سلام ملاحظہ ہو۔

قافلہ شہ کا سلالی لب دریا اترا
پر مقدر میں نہ اک پانی کا قطرہ اترا
امتحان کی جو ترازو میں قضا نے تولا
حُر وفاداریِ شبیرؑ میں پورا اُترا
سجدۂ حق سے نبیؐ نے نہ اٹھایا سر کو
پشتِ اقدس سے نہ جب تک کہ نواسا اُترا
فوج منزل پہ اُترتی تو سکینہ کہتی
صاحبو دیکھو کدھر ہے مرا بابا اُترا
عقد کی صبح کو کس دولہ کا یہ حال ہوا
تن سے سر اُترا سرِ پاک سے سہرا اُترا
گرد بیٹوں کو بٹھا کر یہ کہا زینب نے
میرے بھائی کی بلا رد ہو یہ صدقہ اُترا
جلد وہ دن ہو دبیر آکے کہیں اہلِ نجف
ہند سے آکے کہاں ذاکر مولا اُترا

**نوحہ:**

محرم کی مجلسوں میں سلام، سوز، اور مرثیہ کے بعد کوئی عالم تقریر کرتا ہے۔ تقریر کے خاتمے پر ماتم کا آغاز ہوتا ہے۔ جونہی ماتم کے لیے ہاتھ اٹھتے ہیں نوحہ شروع کر دیا جاتا ہے۔

نوحہ غزل کی صورت میں لکھا جاتا ہے۔ نوحے میں واقعات کربلا کے علاوہ اخلاقی مضامین، دنیا کی بے ثباتی وغیرہ کا ذکر ہوتا ہے۔ غزل کی طرح نوحے میں مطلع، مقطع اور قافیہ ردیف کا التزام ہوتا ہے لیکن اس کی زبان، استعارے اور علامتیں غزل سے مختلف ہوتی ہیں۔

**نمونہ:**

سجدے سے سر کسی کا اٹھا روشنی ہوئی
عشرت کی صبح آئی قیامت بنی ہوئی
اُلٹی ہوئی وہ قاسم و اکبر کی آستیں
عباس نامدار کی تیوری چڑھی ہوئی
پانی کی بندشوں پہ حقارت کی اک نظر
عزت کی موت سے وہ نگاہیں لڑی ہوئی
وہ رخصت حسینؑ وہ پردہ اٹھا ہوا
خیمے میں یا علیؑ کی صدا گونجتی ہوئی
وہ رفتہ رفتہ عالم تنہائی حسینؑ
ننھی سی قبر ہاتھ میں مٹی بھری ہوئی
سجدے وہ جن پہ سجدۂ کون و مکان نثار
حیرت سے کربلا کی زمیں دیکھتی ہوئی

**سانحۂ کربلا کا مختصر خاکہ:**

سانحۂ کربلا کے ہیرو حضرت امام حسینؑ پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ کے چھوٹے نواسے اور اسلام کے ہیرو علیؑ مرتضیٰ کے بیٹے تھے۔ آنحضرت کا تعلق قبیلۂ بنو ہاشم سے تھا۔ چونکہ بنو ہاشم کا عرب میں عزت و احترام تھا اور خانہ کعبہ کے متولی ان ہی میں سے چنے جاتے تھے جو بڑے شرف کی بات تھی اس لیے خاص طور پر بنو امیہ کو بنو ہاشم سے حسد تھا۔ حضرت علیؑ کی شہادت کے بعد امیر معاویہ نے اپنے خلافت کا اعلان کر دیا۔ لیکن مکہ، حجاز اور عراق میں بہت سے لوگ ایسے موجود تھے جو رسول اللہؐ کی جانشینی اور خلیفۂ وقت ہونے کے قابل صرف ان کے جگر گوشے اور نواسے امام حسنؑ اور امام حسینؑ کو سمجھتے تھے۔ انھوں نے امام حسن کو خلیفہ تسلیم کر لیا تھا۔ امیر معاویہ نے امام حسنؑ کے پاس پیام اور قاصد بھیجے اور کچھ شرائط پر صلح کرنی چاہی۔ ایک شرط یہ تھی کہ اگر وہ اس وقت خلافت سے دست بردار ہو جائیں تو امیر معاویہ کے بعد وہی خلیفہ ہوں گے اور ان کے بعد امام حسینؑ۔ غرض صلح نامہ پر دستخط ہو گئے۔ مگر اس کے بعد 50ھ میں امام حسنؑ کو زہر دے کر شہید کر ڈالا گیا۔ امیر معاویہ شام میں لوگوں سے اپنے بیٹے یزید کے لیے بیعت کرنے کا وعدہ لیتے رہے اور جب وہ وفات پا گئے تو یزید نے فوراً اپنے خلیفۂ رسولؐ ہونے کا اعلان کر دیا۔ یزید ایک بدکردار، فاسق و فاجر، ظالم اور ناانصاف شخص تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اُسے اور اس کی خلافت کو سب سے بڑا خطرہ رسولؐ کے نواسے حسینؑ سے ہے جن کی

شرافت، نجابت، زہد و عبادت، دین داری و حق پرستی اور خلق خدا کی خدمت نے عرب لوگوں کے دلوں کو مسخر کر رکھا تھا۔

چنانچہ یزید نے حکومت کا اعلان کرتے ہی مدینے کے حاکم کو حکم بھیجا کہ حسینؓ بن علیؓ سے فوراً میری بیعت لے اور وہ نہ مانیں تو ان کو قتل کر ڈالے۔ مدینۂ رسولؐ میں نواسۂ رسولؐ کو مار ڈالنا آسان نہ تھا۔

امام حسینؓ کوفے کی سمت روانہ ہوئے جہاں سے لوگ برابر آپ کو بلاتے رہے۔ پہلے انھوں نے اپنے چچازاد بھائی مسلم بن عقیل کو کوفہ اپنا سفیر بنا کر روانہ کیا۔ حضرت مسلم اپنے دو لڑکوں کے ساتھ کوفہ روانہ ہوگئے۔ پہلے تو کوفے کے لوگ مسلم کے ساتھ رہے لیکن جب یزید کے گورنر آلِ رسولؐ کا دشمن ابنِ زیاد نے ظلم و سختی شروع کی تو کوئی مسلم سے پھر گئے۔ امام حسینؓ کوفے کی طرف بڑھتے رہے۔ راستہ میں معلوم ہوا کہ حضرت مسلم اور ان کے دونوں لڑکوں کو شہید کر دیا گیا۔ آگے بڑھے تو یزیدی فوج کے ایک افسر حُر بن ریاحی نے آپ کا راستہ روکا۔

ماہ محرم کی دو یا تین تاریخ تھی کہ حسینی قافلہ نینوا کی بستی کے پاس پہنچ گیا۔ یہی بستی تھی جو کربلا کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہاں دریائے فرات کی ایک شاخ بہتی ہے جس کا نام علقمہ تھا۔ امام حسینؓ نے وہاں پڑاؤ ڈال دیا۔ یزیدی فوج کے کچھ دستے امام حسینؓ کے خیمے نہر کے کنارے نصب کرنے میں مانع ہوئے۔ انھوں نے امام حسینؓ کی مختصر فوج کو گھیر لیا۔ تاکہ بندی کر دی اور ساتویں محرم سے پانی بند کر دیا۔

9 محرم کو شمر بن ذالجوشن نے امام کو مزید مہلت دینے سے انکار کر دیا۔ امام حسینؓ نے صرف ایک رات کی مہلت مانگی تاکہ وہ رات عبادت میں بسر کی جائے۔ اسی رات حضرت امام حسینؓ نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ اُن میں کوئی اپنی جان بچا کر جانا چاہے تو جا سکتا ہے کیونکہ صبح ہوتے ہی ان کی شہادت یقینی ہے۔ پھر شمع گل کر دی تاکہ جو جانا چاہے اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے چلا جائے اور اُسے شرمندہ ہونا نہ پڑے۔ ستر کے قریب جانباز رُک گئے۔ عین نماز فجر کے وقت تیروں کی بوچھار سے جنگ کا اعلان ہوا۔

حضرت عباس کو لشکر کا علم بردار چنا گیا اکبر کو سپہ سالار بنایا گیا۔ سب سے پہلے حُر بن ریاحی فوج مخالف سے حسینؓ کی طرف چلا آیا۔ پھر میدان جنگ میں لڑ کر حسینؓ پر اپنی جان قربان کر دی۔ پھر حسینؓ کے رفقا ایک کے بعد ایک میدان کی طرف روانہ ہوئے اور شہادت پائی۔

امام حسینؓ کی شہادت کے بعد خیموں میں آگ لگا دی گئی۔ دوسرے دن عورتوں اور بچوں کو رسی سے باندھا بے کجاوہ اونٹوں پر سوار کیا اور اونٹوں کی مہار امام حسینؓ کے بیمار فرزند سید سجاد کے ہاتھ دی گئی جن کے گلے میں طوق اور پیروں میں بیڑیاں پہنا دی گئی تھیں اور ان کو کربلا سے کوفہ اور وہاں سے شام لے جایا گیا۔ ہر مقام پر حسینؓ کی بہن حضرت زینب اور حضرت اُم کلثوم پُر اثر اور پُر درد خطبے دیتیں۔ شام میں یزید نے اہل بیتِ رسولؐ کو ایک تیرہ و تار قید خانے میں بند کر دیا مگر اب دنیائے اسلام پر اس کی حرکتوں کا راز فاش ہو چکا تھا۔ خود یزید کی بیوی ہندہ جو آلِ رسولؐ اور امام حسینؓ کی عقیدت مند تھی سخت برہم تھی۔ آخر یزید کو مجبور ہو کر اہلِ حرم کو قید سے رہا کرنا پڑا (کربلا کے المیے کا یہ مختصر خاکہ صالحہ عابد حسین کی تصنیف ''انیس کے مرثیے'' سے لیا گیا ہے)

## کتابیات


1. انیس کے مرثیے/صالحہ عابد حسین
2. اردو مرثیہ/اظہر علی فاروقی
3. اردو مرثیے کی سرگزشت/ڈاکٹر اسد اریب
4. اصناف سخن اور شعری ہیئتیں/شمیم احمد
5. خواتین کربلا
کلام انیس کے آئینے میں/صالحہ عابد حسین
6. اصول انتقاد ادبیات/عابد علی عابد
7. اردو مرثیہ کا ارتقا/ڈاکٹر سید حامد حسین
(ماہنامہ ''شاعر'' ممبئی اگست (1968)
8. مرثیہ کی ساجیات/ڈاکٹر عقیل رضوی
9. مرثیہ/علی عباس حسینی


## مرثیہ کی تدریس

(1) کلاس میں مرثیہ پڑھانے سے پہلے ایک طرف تو اس واقعہ کی تفصیل ذہن نشیں کرا دینا ضروری ہے اور اس واقعے کے اہم کرداروں کا تعارف دل نشیں پیرائے میں کرا دینا چاہیے تاکہ طالب علم مطالعے کے دوران الجھن میں نہ پڑیں۔

(2) عرب تہذیب اور معاشرت ہند کی وضاحت ضروری ہے۔

(3) ڈرامے میں واقعہ صرف کرداروں کے مکالموں اور حرکات و سکنات سے بیان ہوتا ہے۔ مصنف کچھ نہیں کہتا۔ مرثیہ میں دونوں صورتیں ہوتی ہیں۔

(4) تلمیحات اور شیعہ عقائد سے کماحقہٗ واقفیت ضروری ہے۔ ورنہ مرثیوں میں بیان کردہ اشارے کنائے سمجھنے میں دقت ہوتی ہے۔

(5) مرثیے کی فضا اور قصہ طالب علموں کو سمجھانے کے بعد مرثیہ کی وحدت تاثر اور اس کی ترتیب کو ذہن نشیں کرنا مناسب ہے۔

(6) طالب علم کو مرثیہ کی مجموعی وحدت کا احساس ہونا چاہیے۔ مرثیہ نگاری میں مجموعی وحدت کو مختلف مناظر اور کیفیات کی تصویر کشی سے حاصل کرتا ہے۔ مثلاً واقعہ شہادت کی المناکی کو اور زیادہ نمایاں کرنے کے لیے صبح کے منظر کی تصویر کشی، تین دن رات پیاسے رہنے والوں کے بیان سے پہلے صحرائے کربلا کا بیان اور بعد میں آنے والے مناظر کی کیفیت کو کتنا المناک بنا دیتا ہے۔

(7) افرادِ مرثیہ سے متعلق تھوڑا بہت علم ضروری ہے۔ ☐☐☐

# فلسفۂ تاریخ اور سماجیات

فلسفۂ تاریخ، تاریخ اور سماجیات کی درمیانی کڑی ہے۔ یہ فکر کا وہ موڑ ہے جہاں سماجیات کی بنیاد پڑی۔ یوں تو فلسفۂ تاریخ کی اصطلاح سب سے پہلے والٹیر نے اٹھارھویں صدی میں استعمال کی لیکن اجتماعی زندگی کی دوسری حقیقتوں کی طرح تجسس اور تلاشِ معانی کا یہ رجحان ہر زمانے میں موجود رہا ہے۔ ہر حقیقت کے دو پہلو ہوتے ہیں: ایک زمانی اور مکانی اور دوسرا لازمانی اور لامکانی۔ ہر سوچنے والا ذہن ظاہر حقیقت کے دونوں پہلوؤں کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور فکر کی اس مشق میں وہ شروع سے معروف ہے۔ مثلاً حیات ہے تو کیا ہے؟ اس سے پہلے کیا تھا اور اس کے بعد کیا ہوگا؟ ہر مفکر نے اس سوال پر فکر آزمائی کی ہے۔ ہر دور نے اس کا جواب دیا ہے۔ فراعین مصر نے بڑے بڑے مقبرے بنوائے اور ہر مردہ فرعون کو غلاموں اور خداموں کے ساتھ زندہ دفن کردیا تاکہ موت کی نیند سے اٹھنے کے بعد خدام موجود رہیں۔ آج یہ بات عجیب نظر آتی ہوگی۔ لیکن اس زمانے کے فلسفے اور عقیدے کی یہ عملی صورت گری تھی اور ان کے افکار کی تہہ میں حیات بعد الممات کا عقیدہ صاف نظر آتا ہے۔ لاشوں پر رنگ و روغن لگا کر جسم انسانی کو دوام بخشنے کی کوشش تصوراتی پرواز کی معراج سے کم نہ تھی۔ اگر تاریخ کو محض واقعات کا بیان اور تجزیہ فرض کرلیا جائے تو فلسفۂ تاریخ اس کی روح ہے۔

مہاتما گوتم بدھ نے ترک لذات کا سبق دیا۔ ان کا خیال تھا کہ ہر تعلق بالآخر منقطع ہونا ضروری ہے۔ تعلق سے لگاؤ پیدا ہوتا ہے اور تعلق کے ٹوٹنے سے درد۔ لہٰذا درد سے اگر بچنا ہے تو بے تعلقی کی راہ اختیار کرو۔ ان کے اس فلسفے کا نتیجہ یہ ہوا کہ بدھ مت نے ترک دنیا کا سبق دیا اور سادگی کا پرچار کیا۔ اس دور کی تاریخ محض سادگی کی تاریخ نہیں ہے بلکہ ایک گہری فکر کی غماز ہے۔ ہر فلسفۂ تاریخ منتشر انسانی کاوشوں کا نچوڑ ہوتا ہے۔ اس کے بغیر اجتماعی زندگی افراد اور اعمال کا ایک دفتر بے معنی ہے۔

فلسفۂ تاریخ کا تعلق تاریخ کی حقیقی نوعیت اور علم تاریخ کی معنوی قدروں سے ہے۔ یہ دراصل تاریخی مواد کا فکری نچوڑ ہے۔ وسیع تر معنوں میں فلسفۂ تاریخ میں تاریخی عقائد اور نقاط نظر دونوں شامل ہیں۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ عقائد اور نقاط ظاہر حقیقتوں سے ماورا ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر کسی زمانے کی اجتماعی زندگی تعلقات کا امتزاج ہوتی ہے۔ اس میں سے ہر تعلق وقتی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ لیکن پورا سماج برتاؤ محض منتشر اعمال کا مجموعہ ہی نہیں ہوتا بلکہ ان اعمال کا ایک مخصوص مقصد ہوتا ہے جس کے لیے یہ ظہور میں آتے ہیں اور یہی وہ نکتہ ہے جو عقیدہ یا فلسفہ کہلاتا ہے مثلاً جمہوری نظام زندگی میں افراد کے مابین جو تعلقات پائے جاتے ہیں وہ ایک خاص رشتے میں منسلک ہوتے ہیں جن کے مجموعی تجزیے کو جمہوری طرز زندگی کہا جاتا ہے۔ اسی طرح کسی مذہبی نظام کی مثال لیجیے۔ اس میں بھی عبادات، اس کی تفصیلات اور فروعات بے حد اہم ہونے کے باوجود مقصود بالذات نہیں ہوتے بلکہ ان کا حقیقی مدعا ایک ایسی زندگی کی تشکیل ہوتا ہے جسے اس مذہبی نظام کا فلسفہ کہا جاسکتا ہے۔ اسی طرح کسی زمانے کی تاریخ محض واقعات کا انبار نہیں ہوتی بلکہ اس زمانے کا ایک مزاج اور آہنگ ہوتا ہے۔ مثلاً بربریت، شہنشاہیت، جمہوریت، سوشلزم، توہم پرستی، عقائد پرستی، مادیت۔ یہ اور اسی قسم کی بے شمار اصطلاحیں خاص نقطۂ نظر کی نمائندگی کرتی ہیں جو کسی مخصوص زمانے میں رائج ہوتی ہیں۔

ابتدائی مورخین نے فلسفۂ تاریخ کی تدوین نہیں کی۔ زیادہ سے زیادہ ان کی تصانیف میں فلسفیانہ افکار ملتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یونانی فلسفیوں نے علم کے بے شمار دروازے کھولے لیکن حقیقی معنوں میں انھوں نے بھی فلسفۂ تاریخ کی طرف توجہ نہیں کی۔ اس کی ابتدا دراصل ابن خلدون اور سنت آگسٹین نے کی جنھوں نے انسانی ارتقا کے طریق پر مجموعی نقاط نظر سے غور کرنے کی طرف توجہ دلائی۔ لیکن اٹھارھویں صدی میں والٹیر اور کنڈورسٹ نے واضح خطوط پر اس سمت اقدام کیا۔ لیکن زمانے کے مورخین نے عیسائیت کے پس منظر میں غیر مذہبی تخیل کو کچھ اس طرح گڈمڈ کردیا کہ فلسفۂ تاریخ کے موضوع کی وضاحت نہ ہوسکی۔ البتہ انیسویں صدی کے نصف سے فطری اور حیاتیاتی علوم کی تحقیقات کے زیرِ اثر ایسے تاریخی قوانین بنانے کی کوشش کی گئی جو تاریخی دھارے کا غیر جانبدارانہ اور سائنسی تجزیہ کرسکیں چنانچہ ہیگل اور بالخصوص کونت نے اپنے نام نہاد فلسفۂ تاریخ میں سائنسی علوم کے اثرات زیادہ قبول کیے۔ کیوں کہ کونت کا خیال تھا کہ سائنسی تحقیق کے ذریعے انسانی ارتقا

● تاریخ اور سماجیات، علم کے دو مختلف گوشے ہیں لیکن یہ بھی سچ ہے کہ تاریخ کا سب سے قریبی تعلق سماجیات سے ہے کیونکہ دونوں کا موضوع انسان، اس کا طرزِ عمل اور کردار ہیں۔ انسانی کردار کی داستان اس کے اخلاق و عمل اور آپسی تعلقات کی داستان ہے اور اخلاق و عمل کا انحصار بڑی حد تک ماضی کے تجربات پر بھی ہوتا ہے— اس کتاب میں اس اہم بحث کو بڑی خوبی کے ساتھ سمیٹا گیا ہے۔ طرزِ بیان استدلالی اور علمی ہے۔ قومی اردو کونسل کی شائع کردہ 140صفحات کی اس کتاب کی قیمت 41روپے ہے۔ طالب علموں اور اساتذہ کو کونسل کی کتابوں پر 40% کی خصوصی رعایت بھی دی جاتی ہے۔

کی روش کو زیادہ آراستہ کیا جاسکتا ہے۔ ہیگل نے اپنے نظریہ، جدلیت، کے ذریعے انسانی ارتقا کی ان قوتوں کو مشاہدہ کی گرفت میں لانے کی کوشش کی جو اجتماعی اتحاد اور انتشار یا ترقی اور تنزل کا سبب بنتے ہیں۔ انیسویں صدی کی ایک خاص بات یہ بھی رہی کہ اس دور میں مورخین دو متضاد مکاتیب خیال میں منقسم تھے۔ ایک کا خیال تھا کہ واقعات اپنی داستان آپ بیان کرسکتے ہیں۔ وہ اپنی جگہ مکمل ہوتے ہیں اور ان کی توضیح اور تشریح حقائق کو مسخ کردیتی ہے۔ اس لیے واقعات پر حاشیہ آرائی اور اس سے استنباط ہمیشہ بھروسہ کے قابل نہیں ہوتا۔ اس کے برخلاف دوسرے مکتب کا خیال تھا کہ ضخیم سے ضخیم تاریخ وسیع اور پیچیدہ انسانی تجربے کی زیادہ سے زیادہ صرف جھلکیاں دکھا سکتی ہے۔ اس لیے ہر تاریخ تشنہ کامی سے عبارت ہوتی ہے اور جب تک کسی دور کے تمام واقعات کو منتشر خطوط سمجھتے ہوئے فکری وجدان کی مدد سے اس کی تشکیل نو نہ کی جائے اس وقت تک اس زمانے کی روح سمجھ میں نہیں آسکتی۔ اس مکتب خیال نے فلسفہ تاریخ کی اہمیت اور ضروریات پر زور دیا۔

تاریخ کے موضوع بحث پر غور کرتے ہوئے مختلف مورخین کے نقاط نظر کا جائزہ لیا جاچکا ہے۔ یہ بات بتائی جاچکی ہے کہ اس کا تحقیقی پہلو علم یا سائنس سے متعلق ہے اور واقعہ نگاری کا تعلق فن سے ہے۔ گویا دونوں حیثیتوں کے امتزاج سے تاریخی شعور ضبط تحریر میں منتقل ہوتا ہے۔ ہیرو ڈوٹس سے لے کر جدید مورخین تک اس فن کے بے شمار نمونے ملتے ہیں۔ لیکن اٹھارھویں صدی سے تاریخی تجربے میں فلسفیانہ جہت کا اضافہ ایک اہم پیش رفت رہی ہے۔ ویکو کو فلسفۂ تاریخ کا بانی اور والٹیر کے ایک مضمون کو تاریخ کا پہلا مضمون کہا جاتا ہے۔ کالنگ ووڈ کا کہنا ہے کہ فلسفہ تاریخ کی اصطلاح والٹیر کی اختراع ہے اور اس کے معنی تنقیدی یا سائنسی تاریخ کے ہیں۔ پروفیسر ہیگل کی رائے میں تاریخ کے فلسفے عالمی تاریخی نظریات ہیں جو اس دور کے شعور کو ظاہر کرتے ہیں جن میں ان نظریات کی تدوین ہوئی۔ والٹیر کا خیال ہے کہ تاریخ لکھنے والے کو فلسفی بھی ہونا چاہیے۔ لیکن تاریخی توضیحات میں فلسفے کا کیا حصہ ہونا چاہیے اس پر کوئی عام اتفاق رائے نہیں ہے۔

تصوراتی اور تنقیدی فلسفۂ تاریخ میں بھی امتیاز کرنا ضروری ہے۔ تصوراتی فلسفۂ تاریخ میں مجموعی طور پر تاریخی طرز کو اہمیت دی جاتی ہے۔ لیکن پروفیسر ڈرے کا خیال ہے کہ یہ طریقہ اب ختم ہوتا جارہا ہے۔ تنقیدی فلسفۂ تاریخ میں مورخ کے واقعہ نگاری کے مفروضات کو اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ ہر ہر مورخ جو حقیقت بیں ہو ذیل کے چار طریقوں میں ایک کو اختیار کرتا ہے۔

1. قیاسی طریقہ ہے جس میں تاریخی واقعات کے معنی تلاش کرکے کوشش کی جاتی ہے کہ تاریخ اس طرح لکھی جائے جیسے حقیقی طور پر واقعات گزرے ہوں گے۔
2. دوسرا مثبت طریقہ ہے جس میں تاریخی مواد کو سائنس کی تکنیک کی مدد سے پیش کیا جاتا ہے۔
3. تیسرا طریقہ تو قیاسی طریقہ ہے جس میں ماضی کی ازسرنو قیاسی تشکیل کی جاتی ہے۔
4. چوتھے طریقہ میں مورخ پیشہ ور نقاد کی طرح ہوتا ہے اور اس کا تعلق تاریخ وضع کرنے اور فراہم کیے ہوئے مواد کی تصدیق کرنے سے ہوتا ہے جس میں توضیحی فیصلے بھی شامل ہوتے ہیں۔

یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ سماجی ارتقا اور ذہنی ارتقا دونوں ہمیشہ ساتھ ساتھ رہے ہیں۔ مذہبی دور میں مذہبی فکر نے اجتماعی زندگی کی توجیہہ کی اور پندرھویں صدی میں نشاۃ ثانیہ کے آغاز کے بعد سائنسی انکشافات اور نئے براعظموں کی دریافت نے رجائیت اور رومانیت کے دروازے کھول دیے۔ اسی دور میں قسمت اور تقدیر کو خیرباد کہہ کر انسان نے ترقی کے عالم امکان کی طرف قدم بڑھایا۔ اس نکتے سے ارتقا کے تعلق سے ایک نیا نظریہ قائم ہوا اور مورخین نے انسانی جدوجہد کے لیے بامقصد انقلاب کی راہ ہموار کی۔ اس دور سے سماج کے تہذیبی اور تمدنی اداروں کو اہمیت دی جانے لگی۔ انسان کا یہ نیا عقیدہ کہ ہر چیز میں بھلائی کا پہلو تلاش کرے، تحقیق اور ترقی کے میدان میں ایک اقدام تھا۔ چنانچہ اٹھارھویں صدی میں ترقی کا فلسفہ نمایاں طور پر فلسفہ تاریخ کا مرکزی شعور بن گیا جو انیسویں صدی میں سماجیات کی بنیاد ثابت ہوا۔

والٹیر کی کتاب 'فلسفۂ تاریخ' جو 1765 میں چھپی صرف اس لیے اہم نہیں کہ اس میں کامل انسان اور کامل اداروں کے نظریات پر بحث کی گئی بلکہ اس لیے اہم ہے کہ اس میں انسانی صلاحیتوں اور ان کے امکانات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ فرانسس بیکن، لاک اور ہیوم نے علمی اکتساب کی بے پناہ وسعتوں اور امکانات پر روشنی ڈالی۔ یہ تمام باتیں اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ انسان نے ترقی کا راز اور اس کی راہ دریافت کرلی جو تاریخی تعبیر اور فلسفے کا سب سے اہم محرک ہے۔ زندگی کی جس نہج کی بنیاد نشاۃ ثانیہ نے ڈالی تھی اور حیات نو کا جو خواب دیکھا تھا اس کی تعبیر پورے طور سے اس وقت تک نہ ہوسکی جب تک کہ اٹھارھویں صدی کے اواخر میں انقلاب فرانس نے ایک بار زندگی کو جھنجھوڑ نہیں دیا۔ یہ انقلاب محض سیاسی نہ تھا بلکہ اس کے سرچشمے سے تاریخ اور فلسفے کے نئے سوتے پھوٹ پڑے۔ اس میدان میں جن اہم مفکرین نے فکر کی راہ مزین کی ان میں سے چند کا مختصر تذکرہ بے محل نہ ہوگا۔

## کانٹ (Kant)

کانٹ نے اس تاریخی نظریے کی بنیاد ڈالی کہ انسان آہستہ آہستہ بڑھتا ہی رہتا ہے چاہے اس کے اقدامات کی معقولیت فوری طور پر ظاہر نہ ہو۔ انسان کی فطرت میں قدرت نے تخلیقی صلاحیت ودیعت کی ہے اور جب اس کی صلاحیت کا مناسب استعمال کیا جاتا ہے تو تمدنی ترقیاں رونما ہوتی ہیں۔ انسان کی ترقی محض اس کا کارنامہ نہیں ہے بلکہ یہ خود قدرت کے منصوبے کا اہم جزو ہے قدرتی ارتقا میں ترقی مضمر ہے لیکن اس کی صورت گری انسان کا

کام ہے، انسانی اجتماعی زندگی تعاون اور عدم تعاون سے عبارت ہے۔ ان دونوں کے عمل اور ردِعمل سے سیاسی اعمال پیدا ہوتے ہیں یعنی انسان اشتراک کا خواہش مند بھی ہے اور علاحدگی پسندی کا بھی۔ وہ محکوم بھی رہ سکتا ہے اور خود مختاری بھی چاہتا ہے۔ اس کے دل میں آگے بڑھنے کا جو جذبہ ہوتا ہے وہ اس کے ذہن کو سماج کے مخالفانہ رویے سے آگاہ کر دیتا ہے۔ جس کی وجہ سے انسان اپنی فطری کاہلی پر قابو حاصل کر کے کامیابی، عزت اور حصول دولت کے لیے کوشاں ہوتا ہے۔ جدوجہد کے یہ تمام پہلو انسان کی سیاسی فطرت کے خاصے ہیں۔ اس نکتے پر ہیگل اور کانٹ دونوں متفق ہیں۔ کانٹ نے یہ تصور پیش کیا کہ انسان سماجی اور سیاسی محرکات کے ذریعے تمدنی ارتقا کی راہ پر گامزن ہے۔ یہ ممکن ہے کہ ترقی کی راہ میں رکاوٹیں پیدا ہوں۔ لیکن جب تک انسان باقی ہے اس راہ کا مسدود ہونا ممکن نہیں۔

## فرانس کے فلسفی

سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں ترقی کے فلسفے کو فرانس میں بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ 1683 میں برنارڈ۔ ڈی فانٹنل نے یہ طریقہ پیش کیا کہ انسان اپنی فطرت کی کاملیت کے لیے علم وفن کی تسخیر میں ہمیشہ کوشاں رہے گا۔ 1737 میں سینٹ پیر نے بھی یہی خیال ظاہر کیا۔ ان تمام مفکرین نے ایجادات اور دریافتوں کے ذریعے ترقی کے امکانات پر بحث کی۔

## ٹرگاٹ (Turgot)

ایک اعتبار سے ٹرگاٹ کو ترقیاتی نظریے کا رہنما کہا جا سکتا ہے۔ بقول کارو ٹرگاٹ کے بعد ترقی کا نظریہ تاریخی حرکیات کا ایک اہم مسئلہ قرار دیا جانے لگا۔ اس کی رائے میں فلسفۂ تاریخ کا مقصد محض واقعات کا مطالعہ نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد دراصل تاریخی تجربات کے مجموعے سے ایسے مقصد یا مقاصد کی تلاش ہوتا ہے جن کی تصدیق تاریخی تجربے سے ممکن ہو۔ ٹرگاٹ کو اس بات کا پورا احساس تھا کہ تمدنی زندگی کے مختلف پہلوؤں میں بعض اوقات ایسی کوتاہیاں یا غلطیاں ہو جاتی ہیں جن کا خمیازہ پورے سماج کو بھگتنا پڑتا ہے۔ اسی لیے ٹرگاٹ نے سماجی تنظیم نو حتیٰ کہ انقلاب کی اہمیت کو قبول کیا۔ اس کا خیال تھا کہ طبقاتی کشمکش تاریخی بہاؤ کی صحیح سمت قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے۔

## کنڈورسٹ (Condorcet)

کنڈورسٹ خود ایک مارکوئس تھا۔ امرا کے طبقے میں وہ دولت مند دانشور کی حیثیت سے مشہور تھا۔ اپنے اس اعلا سامراجی مرتبے کے باوجود اس نے انقلاب فرانس کے دوران آمریت کے زوال کو خوش آمدید کہا۔ اس کو تاریخ سے دل چسپی اس لیے تھی کہ اس کی مدد سے سماجی علوم کے لیے مواد جمع کیا جا سکے۔ اس کا ایقان تھا کہ اس روئے زمین پر ابتدا سے ہی انسان ترقی کی راہ پر مسلسل گامزن رہا ہے۔ گو کہ اس جدوجہد میں بار بار کاوشیں اور ناکامیاں بھی پیش آئی ہیں۔ کنڈورسٹ نے انسانی ارتقا کی تاریخ کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے: پہلا دور سادہ معیشت کا تھا جب کہ لوگ ماہی گیروں یا شکار کرنے والے گروہوں پر مشتمل تھے۔ ارتقا کی دوسری منزل پر سماجی تنظیموں کی بڑھتی ہوئی پیچیدگی نظر آتی ہے۔ اس دور میں جائداد کا تصور اور ضروریاتِ زندگی کی فراہمی اور تحفظ کے لیے سماجی ادارے وجود میں آئے۔ تیسرا دور وہ ہے جس میں سماج کے طبقات میں درجہ بندی شروع ہوئی۔ اس دور میں دولت و اقتدار کی کشمکش بھی اہم سماجی محرک بن گئی۔ کنڈورسٹ کی رائے میں ترقی کا اصل معیار تجربات اور علوم کی فراوانی ہے۔ اسی کو وہ بنی نوع انسان کی ترقی کا راز کہتا ہے۔ وہ تمدن میں ایسے اقدار کے اضافے کا متمنی تھا جس سے تمدنی پیش رفت اور حالاتِ زندگی کے فروغ میں مثبت اضافہ ہو۔ مثلاً گبن کی طرح وہ عیسائیت سے بھی نالاں تھا۔ کیوں کہ اس کے خیال میں عیسائی اقدار نے انسانی ترقی کی راہ میں بعض جمودی لمحات پیدا کر دیے تھے۔ چنانچہ وہ چھاپے خانے کی ایجاد کو نیز مشینی اختراعات کو سفر حیات کے لیے زیادہ سہولت کا باعث سمجھتا ہے۔ اس نے نیوٹن کے سائنس اور لاک اور روسو کے سماجی فلسفے کو زیادہ اہمیت دی۔

## سینٹ سائمن (St. Simon)

سینٹ سائمن انقلاب فرانس کے بعد کا ایک عظیم سماجی مفکر گزرا ہے۔ اس نے انقلاب سے پہلے کی تباہیاں دیکھی تھیں، انقلابی دور سے گزرا تھا۔ اس لیے انقلابی اصلاحات کا حامی تھا۔ اس نے امریکہ کے انقلاب میں حصہ لیا اور گرفتار ہو گیا۔ آزادی کے بعد اس نے اپنی زندگی سماجی اور سیاسی افکار پر غور کرنے میں گزار دی۔ سات سال تک اس کا سکریٹری آگسٹ کونٹ رہا جو بعد کو سینٹ سائمن سے بھی زیادہ مشہور ہوا۔ وہ مستقبل کے بارے میں بہت پرامید تھا۔ اس نے کہا تھا، اس دور کو ہماری پشتوں نے نہیں دیکھا۔ ہماری آئندہ نسل وہاں ایک دن پہنچے گی اور یہ ہمارا کام ہے کہ ان کے لیے راستہ صاف کر دیں، اس کو ایسے اصول اور قوانین کی تلاش تھی جو سماجی مسائل کا تجزیہ کرنے میں مدد دے سکیں۔ سینٹ سائمن اور کنڈورسٹ کی اس بات سے اتفاق تھا کہ تاریخ مستقبل کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ اس کا خیال تھا کہ سماجی اور تجرباتی علوم کا امتزاج ضروری ہے تاکہ اس کی مدد سے سائنسی فلسفہ حاصل کیا جا سکے۔

## آگسٹ کونٹ

آگسٹ کونٹ انیسویں صدی میں فرانس کا مشہور مفکر گزرا ہے۔ یہی وہ مفکر ہے جس نے سماجیات کی اصطلاح وضع کی۔ اور اس نئے علم کی بنا ڈالی جس کے بعد سے سماجیات کو ایک علاحدہ علم تسلیم کیا گیا۔ اگسٹ کونٹ نے

سینٹ سائمن کے خیالات کو مربوط کر کے نئے ڈھنگ سے پیش کیا۔ جس کے نتیجے کے طور پر سماجی مطالعے کے ایک نرالے انداز فکر کی ابتدا ہوئی۔ فرانس کے انقلاب نے یورپی مفکرین کے ذہنوں کو اس قدر جھنجھوڑا تھا کہ لوگ اس انقلاب کو محض ایک تاریخی حادثہ سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھے بلکہ اُن کے ذہن میں یہ بات واضح ہوگئی کہ سماجی، سیاسی اور معاشی طاقتیں تاریخ کے دھارے کا رخ معین کرتی ہیں اور اگر ان طاقتوں میں آہنگ نہ ہو اور یہ ایک دوسرے کے لیے تحفظ کا باعث نہ بن سکیں تو انسانی معاشرہ گرداب تلاطم میں پھنس جاتا ہے جس کے بعد یا تو سماج ڈوبنے لگتا ہے یا سخت طوفانی حوادث کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس لیے تاریخ کو سماجی زندگی کی ان طاقتوں سے الگ کر کے نہیں سمجھا جاسکتا۔ گویا اس انداز فکر کا فلسفہ تاریخ مختلف سماجی قوتوں کے یک جا مطالعے پر منحصر ہے۔ ان حقائق کو سمجھنے کے علاوہ آگسٹ کونٹ نے اپنے بے پناہ مطالعے اور مشاہدے سے یہ بھی اخذ کیا کہ انسانی تاریخ تسلسل کے باوجود مختلف ادوار میں تقسیم کی جاسکتی ہے۔ ادوار کی یہ تقسیم اضافی ہے لیکن چوں کہ ہر دور انسانی سفر میں ایک اہم موڑ کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ اس لیے سہولت کی خاطر ان ادوار کو ایک دوسرے سے علاحدہ متصور کیا جاسکتا ہے۔ کونٹ نے انسانی تاریخ کے تین دور بتائے جس کا تذکرہ سماجیات کی بحث میں بھی آچکا ہے لیکن یہاں بھی اس جانب اشارہ ضروری ہے۔

1. پہلا دور مذہبی تھا جس میں انسان مافوق الفطرت قوتوں نیز توہمات پر یقین رکھتا تھا اور ان ہی عقائد سے اپنی اجتماعی زندگی کی رہنمائی حاصل کرتا تھا۔
2. دوسرا دور مابعد الطبیعاتی دور ہے جس میں انسان عقائد کی منزل سے گزر کر فکری اور منطقی مرحلے میں بھی داخل ہوا اور اپنے عقائد کو صوفیانہ یا مابعد الطبیعاتی رنگ عطا کیا۔
3. تیسرا دور جدید سائنسی دور ہے جس میں انسانی فکر، عقائد اور مابعد الطبیعات سے نکل کر خالص عقلیت کے میدان میں داخل ہو چکی ہے۔ گوکہ آگسٹ کونٹ نے ارتقا کی تاریخ کو ان ادوار میں تقسیم کیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انسانی تاریخ کے ہر دور میں ان تینوں انداز فکر کے لوگ موجود رہے ہیں۔ اس لیے ان کو زمانی اعتبار سے ایک دوسرے سے الگ کرنا درست نہیں۔ البتہ یہ بات ضرور صحیح ہے کہ بحیثیت مجموعی ارتقائی رجحانات کونٹ کے مشاہدے کی توثیق کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

کونٹ کے فلسفۂ تاریخ کا خلاصہ یہ ہے کہ انسانی اجتماعی زندگی کا ارتقا بڑھتی ہوئی فکر کے ساتھ ساتھ نئی جہتیں اختیار کرتا جاتا ہے اور انسانی تاریخ فکری قوتوں کے نچوڑ کا نتیجہ ہوتی ہے۔ یعنی جس زمانے کی فکر جن اقدار کی ترویج کرے گی وہی اس زمانے کی تاریخ کا فلسفہ ہوگا۔ انسانی تاریخ محض ایک پیدائش، موت اور بڑھتی ہوئی آبادی یا بدلتے ہوئے تمدن کا مجموعہ نہیں ہے۔ بلکہ اس تاریخ کو انسانی فکر اور وجدان خاص رنگ عطا کرتے ہیں جسے فلسفۂ تاریخ کہا جاسکتا ہے اور جس کی منزل کبھی خود فراموشی کبھی خود آگاہی، کبھی احترامِ آدم اور کبھی ادراک معانی نیز مقصد حیات کی تلاش ہوتی ہے۔ جیسے جیسے آگسٹ کونٹ کے بیان کیے ہوئے سائنسی دور میں حقائق زندگی پر سے پردے ہٹتے جا رہے ہیں زندگی کے نئے خطوط واضح ہوتے جا رہے ہیں جن میں انسانی فلاح اور انسانی تباہی دونوں کے واضح رجحانات ملتے ہیں۔ اب یہ وقت ہی بتا سکتا ہے کہ فکر اور تقاضوں کے نشیب و فراز کاروانِ حیات کو کس منزل تک پہنچائیں گے۔

## کارل مارکس (Karl Marx)

کارل مارکس دورِ جدید کا ایک عظیم مفکر مانا جاتا ہے۔ جس نے ایک نیا فلسفۂ تاریخ دریافت کیا۔ مارکس ایک انقلابی مفکر تھا۔ اس نے تقریباً ساری دنیا کی تاریخ پر نظر ڈالی اور انسانی ڈرامے کو غور سے دیکھا۔ جس کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ سلطنتوں اور بادشاہتوں کا عروج و زوال تاریخ کا اہم موضوع نہیں ہے بلکہ حقیقی تاریخی فلسفہ ان قوتوں پر منحصر ہوتا ہے جو اس عروج و زوال کے پس پردہ کارفرما ہوتے ہیں۔ کارل مارکس سماجی ترقی کے فلسفے کا قائل نہیں تھا۔ اس کے برخلاف اس کا یہ خیال تھا کہ ساری انسانی تاریخ معاشی استحصال اور استبداد کی تاریخ ہے اور انسانی زندگی کے تمام ادارے اور اس کی تمام شکلیں استحصال اور استبداد کے ان ہی جذبات کی تکمیل کا آلۂ کار رہی ہیں۔ مارکس کی رائے میں معاشی قوتیں سماجی تشکیل میں سب سے زیادہ اہم رول ادا کرتی ہیں۔ بادشاہت ہو یا جاگیردارانہ نظام یا نظام سرمایہ داری ان میں سے ہر ایک کارل مارکس کی نظر میں معاشی قوت رکھنے والوں کے مقاصد کی تکمیل کے لیے عوام کے استحصال میں مصروف رہے ہیں۔ گویا کارل مارکس، معاشی جبریت، کا قائل تھا۔ چونکہ معاشی استحصال تاریخ انسانی میں سب سے زیادہ نمایاں رہا ہے اس لیے اجتماعی زندگی کو اس سے نجات دلانے کے لیے اجتماعی کشمکش اور جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے۔ کارل مارکس کی رائے میں کسی فرد کو سماج پر اہمیت نہیں دی جانی چاہیے۔ تاریخ کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد کارل مارکس اس نتیجے پر پہنچا کہ اگر سماج کو استحصال سے نہ بچایا جائے اور اسے خود اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے تو انسانی زندگی ایک نامعلوم منزل کی طرف بھیانک کشمکش اور تصادم کے مراحل سے گزرتی رہے گی اور اجتماعی زندگی میں معنی اور مقصد نہ پیدا ہونے پائیں گے۔ گویا کارل مارکس کے افکار نے انیسویں صدی میں فکر اور شعور کی نئی مشعلیں روشن کیں جس کی مدد سے ناانصافی اور محرومیوں کو ختم کر کے بہتر اجتماعی زندگی کی تشکیل کی جاسکتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ کارل مارکس کے فلسفے میں معاشی قوتوں کی اہمیت کو دیگر سماجی قوتوں پر جو فوقیت دی گئی ہے وہ صحیح نہیں

ہے۔ کیوں کہ اجتماعی زندگی محض معاشی یا سیاسی یا سماجی یا مذہبی قوتوں کے زیرِ اثر پوری طرح ترقی نہیں کرسکتی۔ بات دراصل یہ ہے کہ کارل مارکس کی معاشی جبریت، کا نظریہ انیسویں صدی کے سرمایہ داری کے غیر معمولی استحصال کا ردِعمل تھا۔ ورنہ معاشی قوتوں کو دیگر سماجی قوتوں کے ساتھ متناسب اور متوازن اہمیت دی جانی چاہیے۔ اس کے باوجود فلسفۂ تاریخ کی اہمیت کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔

## گیاسٹ (Gasset)

گیاسٹ اسپین کا ایک اہم مفکر ہے۔ اس کا خیال تھا کہ انسان اور اس کے ماحول میں مسلسل کشمکش جاری رہتی ہے۔ یہ دونوں علاحدہ اور مکمل اکائیاں ہونے کے باوجود ایک دوسرے پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے گیاسٹ نے کہا تھا کہ میں 'میں' ہوں اور میرے گرد واقعات یا گویا فرد اور واقعات کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ اگر فرد کی انفرادیت کی حفاظت نہ کی جائے تو وہ اپنا وجود کھو بیٹھے گی۔ اسی طرح اگر حالات کا تحفظ نہ کیا جائے۔ تو فرد یک و تنہا، لاچار اور مجبور ہوکر رہ جائے گا۔ گویا دونوں کی حفاظت، تقویت، توازن اور برقراری ایک دوسرے کے لیے ضروری ہیں۔ بالفاظ دیگر تاریخ کا دھارا ان دونوں کے موقف اور رول پر منحصر ہوتا ہے۔ دونوں کو حادثات اور اتفاقات کے حوالے نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ مقصدیت پیدا کرنے کے لیے دونوں کا باشعور نشوونما ضروری ہے۔ ایک دوسرا مفکر آرمیگا بھی حالات اور واقعات کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے کہتا ہے کہ زندہ رہنے کے لیے دنیا سے تعلق رکھنا اور اس میں سرگرم رہنا ضروری ہے کیوں کہ اجتماعی زندگی وقت کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ خاص مقصد اور منزل کی طرف رواں دواں رہتی ہے اور اسی کی نشاندہی تاریخ کا فلسفہ ہوتی ہے۔

## ژان پال سارترے (Jean Paul Sartre)

ژان پال سارترے آج کا ایک عظیم مفکر ہے۔ اس کا خیال ہے کہ انسان اپنے آپ میں گھرا ہوا ماحول کے تقاضوں سے مسلسل برسرِ پیکار ہے حقیقی معنوں میں تو وہ بہت کم اختیار رکھتا ہے کیوں کہ اس کی تمام جدوجہد کا انحصار ایسے بہت سے دیگر عوامل پر ہوتا ہے جو اس کے دائرۂ اختیار سے خارج ہوتے ہیں۔ انسان زیادہ سے زیادہ صرف اتنا کرسکتا ہے کہ وہ غور و فکر کرے اور خود اپنے آپ سے سوالات کرے۔ گویا اس طرح انسان بڑی حد تک ایک بے بس مخلوق ہے۔ سارترے کی طرح دوسرے مفکرین نے بھی انسانی زندگی کے معنے کو انتہائی غیر واضح بلکہ بے معنی قرار دیا ہے۔ چنانچہ والٹر کے مطابق 'دنیا ایک جنگل ہے جس میں کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کون ہے۔ ہر شخص نقاب پوش ہے کیوں کہ وہ خطاؤں کا پتلا ہے جس نے اپنی خطاؤں کو چھپانے کے لیے مختلف قسم کے نقاب ڈال رکھے ہیں۔ ہیکمٹ انسان کو یک و تنہا بتاتا ہے اور آکنسکو اسے جانور کہتا ہے۔ اور کمیٹ کا خیال ہے کہ انسان اپنی تنہائی اور موت سے بچنے کی مسلسل جدوجہد میں مصروف رہتا ہے۔

لیکن حال کے گھرے ہوئے ماحول کا انسان اور اس کا تاریخی شعور اسے اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ وہ محض ماضی کو نہ دیکھے بلکہ موجودہ زمانے کے تقاضوں کا جائزہ لے۔ نئے رجحانات کے تحت قدامت پرستی کم ہورہی ہے۔ نئے فلسفے کا رجحان اب یہ ہے کہ تاریخی فلسفے کے مسائل کا تنقیدی جائزہ لیا جائے اور تاریخ کی نوعیت اور اس کے جواز کو ثابت کرنے کی کوشش کی جائے کلاسیکی دور میں روایات اور عقائد کو زیادہ اہمیت دی جاتی تھی لیکن رومانیت کے رجحان نے احساسات اور تصورات کو زیادہ اہم بنادیا۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ رومانیت نے تاریخ کے فلسفے کو جنم نہیں دیا۔ البتہ جب سے انیسویں صدی میں ارتقائی نظریوں کا آغاز ہوا ہے تو اس وقت سے ضرور اس بات کی کوشش جاری ہے کہ سماجی ارتقا کی ان قوتوں کو تلاش کیا جائے جو تاریخی دھاروں کا محرک ہوتی ہیں۔ چنانچہ انیسویں صدی کے دوسرے دہے سے، سماجی معنویت کے عوامل اور مضمرات کو سمجھنے کے لیے سماجیات کی بنیاد پڑی۔ جس کا مقصد یہی تھا کہ اجتماعی زندگی اور انسانی تاریخ کا ساتھ ساتھ مطالعہ کیا جائے۔

اوپر بیان کیے ہوئے تمام مفکرین کے نقاط نظر کے پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ان افکار کا جائزہ لیا جائے جو تاریخ نویسی اور سماج فہمی میں بنیادی اہمیت کے حامل رہے ہیں۔ تاریخ کے بارے میں ہم یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ انسانی تاریخ خود انسان کی تخلیق ہے۔ اس لیے ہر تاریخ انسانی مشاہدے اور نقطۂ نظر کی پابند ہے۔ اس اعتبار سے ہر بدلتا ہوا نقطۂ نظر تاریخ کا ایک نیا فلسفہ اور ایک نیا موڑ ثابت ہوتا ہے لیکن ایک بڑے مفکر اور مورخ کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ بے شمار افکار میں آفاقی اقدار کی تلاش کرے تاکہ تاریخ کے عالمی بہاؤ کے رخ کی نشاندہی ممکن ہوسکے۔ ٹوائن بی اور اسپنگلر کی محض یہ خوبی نہیں ہے کہ انھوں نے غیر یورپی اقوام کی بہت تفصیلی جامع اور عمدہ تواریخ لکھیں بلکہ ان کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے انسانی ارتقا کے محرکات اور مضمرات کو اپنی تحقیق کے ذریعے واضح طور سے پیش کیا اور یہی مشترک عوامل اور رجحانات تاریخ کا فلسفہ کہے جاسکتے ہیں۔ یہاں یہ بات یاد رکھنی ضروری ہے کہ فلسفہ تاریخ کے ان جدید رجحانات کی دریافت میں سماجیاتی نقطۂ نظر کا انتہائی اہم حصہ رہا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ جب ابتدا میں سماجیات کی کتابیں منظرِ عام پر آئیں تو بعض مفکرین نے سماجیات کو فلسفۂ تاریخ کا نام دیا۔ اگرچہ کہ حقیقت یہ ہے کہ سماجیات ایک علاحدہ علم ہے البتہ جب تک یہ علم فلسفے اور ناول کی ابتدائی منزلوں تک محدود رہا اسے فلسفۂ تاریخ کہا گیا۔ بہرحال یہ ایک حقیقت ہے کہ فلسفۂ تاریخ تاریخ اور سماجیات کی درمیانہ کڑی ہے۔

□□□

شری ناتھ سہائے

کیریئر گائیڈنس

# لائبریری اور انفارمیشن سائنس میں کیرئیر کے مواقع

## لائبریری کا آغاز:

لائبریری کا نام لاطینی لفظ "لائبر" سے لیا گیا ہے جس کے معنی ہیں کتاب۔ لائبریری کی تاریخ دراصل نظام تحریر کی کتابوں اور دستاویزات و مخطوطات انھیں بحفاظت و باترتیب رکھنے سنوارنے کے طریقوں اور ترکیبوں اور سب سے اہم ان شاہکاروں کے قدردانوں کو دستیاب کرانے کی دلفریب و ولولہ انگیز کوششوں کی طویل اور تاریخ ساز داستان ہے۔

انسانی تہذیب و تمدن کے بالکل ابتدائی دور میں کتابیں مٹی کی ٹکیوں اور پیپرس اور چمڑے پر لکھی جاتی تھیں۔ بعد ازاں لپٹا ہوا چرمی/جھلی سے بنے کاغذ کا استعمال ہونے لگا اور کتابوں کی تیاری کی رفتار تیز ہوتی گئی۔ انیسویں صدی کے اوائل اور خاص طور پر بیسویں صدی میں کتابوں کی تیاری میں قابل لحاظ ترقی ہوئی، موجودہ دور کو بجا طور پر ہر طرح کے ادب کے عروج کا دور کہا جاسکتا ہے۔ اس میں اجتماعی اور انفرادی دونوں سطحوں کی مطبوعات شامل ہیں۔ زندگی کی ضروریات اور مسائل کو سائنس، فلسفہ اور روحانیت کے آئینے میں دیکھا اور پرکھا جاتا ہے اسی کے ساتھ علم کی سرحدیں بھی دن بدن وسیع تر ہوتی جارہی ہیں عالمی سطح پر مقابلہ آرائی کے تناظر میں ہر ملک کو اپنے مخصوص حالات کے تقاضوں اور وسائل کے لحاظ سے سائنس، ٹیکنالوجی اور سماجی ترقی کے شعبوں میں اہم کردار ادا کرنا ہے۔

## لائبریری کی ضرورت:

سماجی اور ثقافتی ترقی کے ساتھ کتب بینی کی ضرورت اور اس کے ذوق و شوق میں بھی بتدریج اضافہ ہورہا ہے۔ قارئین کی طرف سے کتابوں کی مانگ میں اضافے کے ساتھ کتب خانوں پر بھی ان کا دباؤ بڑھتا جارہا ہے۔ معاشرتی زندگی میں جمہوری اقدار نے عوام الناس میں کتب خانوں کی اہمیت وافادیت کا شعور پیدا کیا ہے۔ سماج کا خاص و عام غریب و امیر طبقہ کم و بیش کتب خانوں کی سہولت سے مستفید ہونے کا خواہاں نظر آتا ہے۔ اس سے کتب خانوں کے نظام کو مضبوط و مستحکم و فعال بنانے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ ملک میں قومی، یا ضلعی سطح پر یا تعلیمی اداروں یعنی اسکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں اور تحقیقی اداروں، خاص طور پر بچوں کی لائبریریوں کی عدم دستیابی، وہاں کی سماجی، اقتصادی اور ثقافتی ترقی کی راہ میں زبردست رکاوٹ ہے۔ اس کی ترقی اور خوشحالی کی راہیں مسدود ہیں۔ خوش قسمتی سے ہندستان نے جدید لائبریری نظام کی ضرورت کو پوری طرح محسوس کیا ہے اور اس کو جدید طرز پر ترقی دینے اور اس کو منظم کرنے کی تمام امکانی کوششیں کی جارہی ہیں۔

## تربیت یافتہ عملے کی ضرورت:

لائبریری کتابوں کو حرکت میں لاتی ہے۔ لائبریرین انسانی اور موجودہ سابقہ نسلوں کے گرافک ریکارڈ کے مابین بچولیے کا کام کرتا ہے۔ لائبریری سروس کا بنیادی مقصد انسان میں مناسبت و تصوریت پسندی کی پرورش کرنا، انسانی جذبے کی بے پایاں اور بیکراں امنگوں کو مضبوط کرنا اور اس کی تشنگی کو علم کے چشموں سے سیراب کرنا ہے۔ لائبریرین کی بنیادی ذمے داری بنی نوع انسان کی بہتری اور بھلائی کے لیے اس کے نوشتہ ریکارڈ کی سماجی افادیت کو بدرجۂ اتم بڑھاوا دینا ہے۔ اس مقصد برآری کے لیے لائبریرین کی پیشہ ورانہ کامیابی ضبط تحریر میں لائی گئی تمام معلومات کو بہتر سے بہتر طور پر سمجھنے اور اس کو دوسروں کے لیے نتیجہ خیز انداز میں بروئے کار لانے منحصر ہے۔ یہ کہنا کہ ہر کس و ناکس جو صرف لکھنا پڑھنا جانتا ہو لائبریری کو آسانی سے چلا سکتا ہے۔ سراسر غلط اور عدم واقفیت پر مبنی خیال ہے۔ پہلے زمانے میں لائبریرین اپنی کوشش و لگن سے لائبریری کے بندوبست کے طور طریقے خود سیکھتا اور اپنے مددگاروں کو اپنے تئیں اس فن کے بنیادی اصول سکھاتا تھا لیکن یہ طریقہ اس طرح کے اداروں کی ضروریات اور تقاضوں کو پورا کرنے میں ناکافی ثابت ہوتا تھا۔ موجودہ دور میں لائبریری کا تصور بدل گیا ہے۔ معاشرے میں اس کے کردار کو کافی وقار اور دائرۂ کار کو وسعت حاصل ہوئی ہے۔ لہٰذا لائبریرین اور اس کے عملے کو تعلیمی اور پیشہ ورانہ لحاظ سے زیادہ مستعد، تربیت یافتہ اور زیرک بنانا اشد ضروری ہے۔ لہٰذا اس کے لیے خصوصی نوعیت کی پیشہ ورانہ تعلیم وتربیت کی بنیادی ضرورت کو متفقہ طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔

## لائبریری سائنس کورس:

لائبریری اسٹاف کی تربیت کا سلسلہ غیر رسمی اپرنٹس شپ سے شروع ہوا۔ پہلا لائبریری اسکول 1887 میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں قائم ہوا تھا۔ 1919 میں یونیورسٹی کالج لندن میں کل وقتی برٹش لائبریری اسکول کی بنیاد رکھی گئی۔ ہندستان میں 1929 میں مدراس لائبریری ایسوسی ایشن نے لائبریری اسکول قائم کیا۔ 1931 میں اس اسکول کو یونیورسٹی کی تحویل میں دے دیا گیا۔ موجودہ دور کی لائبریری میں کتابوں، رسالوں، جریدوں وغیرہ کا آرڈر دینا انھیں حاصل کرنا، ان کی درجہ بندی اور کیٹلاگنگ وغیرہ کام پیشہ ورانہ انداز میں کرنے ہوتے ہیں۔ ان کا باقاعدہ بجٹ بنایا جاتا ہے اور ان کے حساب کتاب کو سنبھالنا ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ بعض قارئین کو ریفرنس سروس کی ضرورت ہوتی ہے جو انھیں فراہم کی جاتی ہے۔ لائبریری نظام کے ان تمام پہلوؤں کو مدنظر رکھ کر

جدید لائبریری سائنس کورس مرتب کیے جاتے ہیں اور مختلف مرحلوں میں لائبریری اسٹاف کورس کے مطابق تعلیم و تربیت دی جاتی ہے۔ سر دست لائبریری سائنس کے حسب ذیل کورس پیش کیے جاتے ہیں۔

## (الف) سرٹیفکیٹ کورس (لائبریری سائنس):

اس کے لیے کم سے کم اہلیت ہائر سیکنڈری پاس ہے۔ یہ کورس 3 سے 6 ماہ کا ہوتا ہے۔ اس کورس کا لائبریری ایسوی ایشن یا ریاستی سرکار یا دونوں اہتمام کرتی ہیں۔ اس کورس کے ذریعے طلبہ کو سیمی پروفیشنل یا چھوٹے پیمانے کی لائبریری کے لائبریرین کی حیثیت سے کام کرنے کی تربیت دی جاتی ہے۔ بنگال لائبریری ایسوی ایشن، کلکتہ، دہلی لائبریری ایسوی ایشن دہلی، اسٹیٹ سینٹرل لائبریری (نظام تعلیم کے تحت) مغربی بنگال، اتر پردیش لائبریری ایسوی ایشن اس طرح کے انڈر گریجویٹ کورسوں کا بندوبست کرتی ہیں۔

ان کے علاوہ چند یونیورسٹیاں مثلاً اناملائی یونیورسٹی تامل ناڈو، کوٹا اوپن یونیورسٹی راجستھان، مدراس یونیورسٹی چنئی، پنجاب یونیورسٹی پٹیالہ اور راجستھان یونیورسٹی جے پور میں اسی طرح کے 4 سے 12 ماہ کے کورس پیش کیے جاتے ہیں۔

## (ب) ڈپلوما/ بیچلر آف لائبریری اینڈ انفارمیشن سائنس:

کئی یونیورسٹیوں میں ابتدا میں یہ ایک سالہ کل وقتی کورس ہوتا تھا۔ یہ بی.لب.ایس.سی. ڈگری کے مساوی مانا جاتا تھا۔ اس کے لیے بنیادی اہلیت گریجویٹ ڈگری تھی بعد میں اس کورس کو بی لب ایس سی کا پورا نام دیا گیا۔ اب ملک کی تمام یونیورسٹیوں میں یہ کورس موجود ہے۔ اس کورس میں داخلہ انٹرنس ٹیسٹ کی بنیاد پر لیا جاتا ہے۔

## (ج) ماسٹر آف لائبریری اینڈ انفارمیشن سائنس:

یہ بی لب ایس سی کے بعد ایک سالہ کورس ہے جسے دہلی یونیورسٹی نے 1948 میں شروع کیا تھا۔ یہ کورس لائبریریوں اور انفارمیشن اور ڈاکومینٹیشن سینٹروں میں اعلا عہدوں یا لائبریری اور انفارمیشن سائنس کے ٹیچروں کی حیثیت سے خدمات انجام دینے کے لیے ضروری ہے۔ اس وقت ملک کی 30 یونیورسٹیوں میں بی ایل آئی ایس، 60 یونیورسٹیوں میں ایم ایل آئی ایس سی کورسوں کا بندوبست ہے۔ 8 یونیورسٹیوں میں ایم فل اور 35 یونیورسٹیوں میں اس شعبے میں پی ایچ ڈی پروگرام جاری ہیں۔ ان کے علاوہ ریسرچ اینڈ ٹریننگ سینٹر (ڈی آر ٹی سی) بنگلور اور انڈین نیشنل سائنٹفک ڈاکومینٹیشن سینٹر (آئی این ایس ڈی او سی) میں لائبریری اینڈ انفارمیشن سائنس میں ایک سالہ ایسوی ایٹ شپ کورس بھی ہے۔ اندرا گاندھی اوپن یونیورسٹی دہلی اور کئی دیگر ریاستی اوپن یونیورسٹی سے فاصلاتی تعلیم کے پروگراموں کے تحت بھی اسی طرح کے کورس کیے جاسکتے ہیں۔

کئی غیر ملکی یونیورسٹیاں بھی اسی طرح کے پیشہ ورانہ کورس پیش کرتی ہیں۔ ان کے لیے وظیفے بھی دیے جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں مزید معلومات ہندستان میں برٹش کونسل اور یو ایس آئی ایس سے حاصل کی جاسکتی ہیں۔

روزگار سماچار اور کئی دیگر روزناموں میں بھی اس سلسلے میں اکثر و بیشتر کیریئر پیج پر اشتہارات شائع ہوتے رہتے ہیں۔

## روزگار کے مواقع:

ملک میں عمدہ لائبریری نظام کو موثر طریقے سے چلانے کے لیے مناسب تعداد میں تربیت یافتہ عملے کی شدید ضرورت ہے۔ لہٰذا حالیہ دنوں میں لائبریری پروفیشنلز کی مانگ میں کافی اضافہ ہونا بالکل قدرتی ہے۔ لائبریری سائنس کے ضروری اہلیت یافتہ ٹیچروں کی قلت ہے۔ اس شعبے میں معمولی اہلیت و تربیت یافتہ عملہ بھی ضرورت سے کم ہے۔ لائبریری سائنس اور سروسیز میں آٹومیشن (خودکاری) اور ڈیجیٹلائزیشن (کمپیوٹر کاری) نے لائبریریوں کے نظام کار میں انقلاب پیدا کردیا ہے۔ قارئین اپنے مطالعاتی اور تحقیقی سرگرمیوں کے لیے لائبریریوں کو زیادہ پرامید نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور ان پر زیادہ انحصار کرتے ہیں۔ لائبریرین کے لیے روزگار کے مواقع پبلشنگ ہاؤسیز، کتب فروش تنظیموں اور سافٹ ویئر کمپنیوں، تجارتی کارپوریٹ آفیسز میں بھی دستیاب ہوتے ہیں۔

## تنخواہ اور حیثیت:

حالیہ برسوں میں لائبریری کا پیشہ کافی نفع بخش ہوگیا ہے اور اب تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لیے خاص کشش رکھتا ہے۔ ان کے عملے بالخصوص تعلیمی اور خصوصی لائبریریوں کے عملے کی تنخواہ اسکیلوں پر نظرثانی کے بعد ان کی تنخواہ اسکیل کالجوں، یونیورسٹیوں اور تحقیقی اداروں اور سائنسی تحقیق و فروغ کی تنظیموں کے ٹیچروں کی تنخواہ اسکیلوں کے مساوی ہوگئے ہیں۔ اسی لحاظ سے ان کی حیثیت میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ البتہ پبلک لائبریری سسٹم کے تحت آنے والے عملہ کے تنخواہ گریڈوں کو بہتر بنانے کی ضرورت ہے۔

خواتین بہتر لائبریرین ثابت ہوتی ہیں۔ کتابوں سے والہانہ محبت کرنے والے افراد زیادہ کامیاب اور نتیجہ خیز لائبریرین ثابت ہوتے ہیں۔ ان کے لیے یہ پیشہ دلچسپی، دلجمعی سے مالامال ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ لائبریرین کا پیشہ موجودہ ہندستان کے کسی اور پیشے سے کسی طرح کمتر نہیں ہے۔ اس کے لیے ہم ہندستان میں لائبریری سائنس کے بانی ڈاکٹر ایس آر رنگاناتھن کے مرہون منت ہیں۔

**(بشکریہ "روزگار سماچار" نئی دہلی، 12 رجون 2004)**

5/898, Varm Lucknow Khand-5,
Gomti Nagar, Lucknow (U.P.) - 226010

□□□

شفقت علی

# فرنٹ پیج

## تیسرا مرحلہ: ایک ڈائرکٹری اسٹرکچر بنانا

اگر آپ کی ویب سائٹ میں استعمال ہونے والی HTML فائلوں اور تصاویر کی تعداد تھوڑی ہے تو آپ انھیں ایک ہی ڈائرکٹری میں رکھ سکتے ہیں لیکن پیچیدہ قسم کی سائٹس میں فائلوں کی تنظیم کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اس کے لیے آپ مختلف اقسام کی فائلوں کو مختلف ڈائرکٹریوں اور سب ڈائرکٹریوں میں رکھتے ہیں تاکہ ویب سائٹ بناتے ہوئے ان کی بروقت دستیابی ہو اور سائٹ کو منظم رکھنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔

ویب سائٹ کی فائلوں کے لیے ڈائرکٹری اسٹرکچر بنانے کے عمل کو سائٹ میپنگ (Site Mapping) کہا جاتا ہے۔ ویب سائٹ کے لیے ایک منطقی ڈائرکٹری اسٹرکچر بنانا منصوبہ بندی کا اہم حصہ ہے۔ یہ اس وقت بہت مفید ثابت ہوتا ہے جب آپ ویب سائٹ میں مختلف فائلوں اور تصاویر کے لیے لنکس (Links) استعمال کرتے ہیں کیونکہ ان لنکس (Links) میں درست پاتھ دینا ضروری ہوتا ہے۔ اگر آپ بعد میں ان فائلوں کی جگہ تبدیل کردیں گے، ان کے نام تبدیل کر دیں گے یا لنکس میں غلط پاتھ دیں گے تو یہ لنکس صحیح کام نہیں کریں گے۔

ٹوٹکا: فرنٹ پیج آپ کو ویبز (webs) بنانے کی سہولت دیتا ہے جو ڈائرکٹریوں کی ہی ایک جدید شکل ہے۔ ان ویبز کے اندر آپ سائٹ کے اجزا کو منظم کر سکتے ہیں۔ جب آپ فرنٹ پیج کو استعمال کرتے ہوئے ویب سائٹ بناتے ہیں تو آپ کسی بڑے ویب (آپ کی سائٹ) کے اندر ویبز یا ڈائرکٹریاں بنا سکتے ہیں۔ ویبز بنانے سے آپ کو یہ فائدہ حاصل ہے کہ آپ اپنی سائٹ کے مختلف حصوں کو لکھنے یا اپ ڈیٹ کرنے کے لیے مختلف لوگوں کے حوالے کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر آپ ایک ویب میں موجود Press Relations کے متعلقہ مواد کو کسی شخص کے حوالے کرتے ہیں لیکن وہ شخص کسی اور ویب میں موجود Tech Support کے مواد کو حاصل نہیں کر سکتا۔

آپ اس مرحلے میں پچھلے مرحلے کے مطابق حاصل کردہ معلومات استعمال کر سکتے ہیں۔ آپ کو چاہیے کہ اپنے پیجز کو ایک top-down ڈائرکٹری اسٹرکچر میں منظم کریں جس طرح آپ ہارڈ ڈسک میں فائلوں کی مختلف ڈائرکٹریوں کے اندر تنظیم کرتے ہیں۔

ڈائرکٹری اسٹرکچر کو دیکھنے کے لیے ایک باکس بنائیں (آپ کاغذ اور قلم یا ڈیزائننگ کا سافٹ ویئر استعمال کر سکتے ہیں) جو آپ کے ہوم پیج (Home Page) کو ظاہر کرتا ہے۔ اس کے نیچے ایک افقی لائن لگائیں اور اس لائن کے نیچے باکسز بنائیں جو اہم مواد رکھنے والی ڈائرکٹریوں کو ظاہر کرتے ہیں۔ آپ کم اہم مواد رکھنے والی سب ڈائرکٹریوں کو ظاہر کرنے کے لیے ان باکسز کے نیچے مزید باکسز بنا سکتے ہیں۔

جب آپ ایسا کرلیں گے تو سوچیں کہ کن پیجز کو دوسرے پیجز یا ہوم پیج کے ساتھ لنک کرنا ہے اور ایک ہی پیج کی دو کاپیاں دو مختلف ڈائرکٹریوں میں ہرگز نہ رکھیں۔ نوٹ کریں کہ سائٹ میں استعمال ہونے والے ہر پیج یا فائل کو ایک یا دوسری ڈائرکٹری میں رکھیں۔ ڈائرکٹریوں اور سب ڈائرکٹریوں کے نام مختصر اور جامع رکھیں۔ مثال کے طور Joblistings کی بجائے Jobs نام رکھیں۔

ٹوٹکا: بڑی سائٹس کے اندر آپ مختلف عناصر کے لیے علیحدہ ڈائرکٹریز استعمال کرتے ہیں۔ اس کے عام استعمال images کی ڈائرکٹری ہے۔ زیادہ تر ویب ڈیزائنرز اس ڈائرکٹری کے اندر پوری سائٹ میں استعمال ہونے والی تصویریں رکھتے ہیں۔ اسی طرح آپ مختلف عناصر کے لیے مختلف ڈائرکٹریز بنا سکتے ہیں۔

## چوتھا مرحلہ: اسٹوری بورڈ تیار کرنا

اب اپنے ہوم پیج اور اس کے ساتھ لنک ہونے والے پیجز کا اسٹوری بورڈ (خاکہ) تیار کریں۔ اپنے اس خاکے میں اپنے خیال کے مطابق تمام عناصر مثلاً تحریر، تصاویر، بٹن، ہائپر لنکس وغیرہ شامل کریں۔ ان اجزا کی سیٹنگ میں کوئی ڈر محسوس نہ کریں کیونکہ یہ آپ کا حتمی ڈیزائن نہیں ہے بلکہ یہ بھی سائٹ کی تنظیم کا ہی حصہ ہے نیز اگر یہ ڈیزائن آپ کے اصل نظریے کے مطابق نہیں ہے تو اسے ختم کریں اور دوبارہ سے ڈیزائننگ شروع کریں۔ یہ خاکہ ذیل کی شکل میں دکھایا گیا ہے۔

homd
what's new products feedback
events press releases widgets type 1 widgets type II widgets type III e-mail support

**نوٹ:** سائٹ کی عمومی منصوبہ بندی اور ڈائرکٹری اسٹرکچر بنانے کے بعد

آپ نے نوٹ کیا ہوگا کہ آپ کی سائٹ کے اجزا مختلف اقسام کے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو آپ مختلف پیج ٹیمپلیٹس میں کام کر سکتے ہیں جن کے اندر آپ مختلف اجزا رکھیں گے۔ آپ فرنٹ پیج کو استعمال کرتے ہوئے آسانی کے ساتھ یہ کام کر سکتے ہیں۔ لیکن یاد رکھیں کہ ایک ویب دراصل لنکس کا مجموعہ ہوتا ہے اور ناظرین اس پورے ویب کو ایک ناول کی طرح مسلسل نہیں پڑھ سکتے بلکہ لنکس کو استعمال کرتے ہوئے صفحہ بہ صفحہ پڑھتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ کسی دلچسپ چیز پر تیزی کے ساتھ پہنچیں اور پھر وہاں سے کسی اور تک۔ ناظرین کسی اور سائٹ سے آپ کی سائٹ کا لنک استعمال کرتے ہوئے بھی اسے کھول سکتے ہیں۔ اس لیے آپ کی سائٹ اس قابل ہونی چاہیے کہ ناظرین کسی پریشانی اور وقت کے ضیاع کے بغیر پسندیدہ اجزا پر حرکت کر سکیں۔ اگر آپ کی سائٹ میں گھومنے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو ہو سکتا ہے کہ استعمال کنندگان دوبارہ اس سائٹ کی طرف رخ ہی نہ کریں۔ اس مقصد کے لیے آپ سائٹ میں ٹیکسٹ لنکس اور خوبصورت بٹنوں کو بطور لنکس بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ سائٹ میں یہ سہولت پیدا کریں کہ ناظرین ایک کلک کر کے ویب سائٹ کے مختلف حصوں اور پیجیز تک رسائی حاصل کر سکیں۔ ایسا کرنے کے بے شمار طریقے ہیں لیکن آپ جو بھی طریقہ استعمال کریں اس میں اہم بات یہ ہونی چاہیے کہ وہ آسانی سے دکھائی دے اور اسے استعمال کرنے میں بھی کوئی مشکل پیش نہ آئے۔

ایک پہلے سے موجود ویب سائٹ اور ایک ایسی سائٹ کے درمیان فرق کو ذہن میں رکھیں جو آپ کے ڈیزائن میں پیچیدگی اور تکنیکی مشکلات کی وجہ سے فضول ہے ساتھ ہی سائٹ کے ہر پیج کو اس طرح ڈیزائن کریں کہ وہ ایک بڑی سائٹ کا حصہ ہونے کے باوجود اکیلا ٹھیک کام کر سکے۔ یہ سوچ لیں کہ آپ کون سے رنگ استعمال کرنا چاہتے ہیں، کون سے فونٹ اس سائٹ میں کام کریں گے اور مندرجہ ذیل اشیا کو آپ کہاں رکھیں گے۔

- ☆ نیوی گیشن (سائٹ میں گھومنے کے لیے مددگار) عناصر مثلاً بٹن اور ٹیکسٹ لنکس وغیرہ۔
- ☆ اپنی شناخت کے بینر، لوگو وغیرہ۔
- ☆ گرافکس اور دوسرا آرٹ کا کام۔
- ☆ تمام اقسام کی تحریر۔
- ☆ کسی قسم کا نوٹس یا کاپی رائٹ کی تحریر۔

## پانچواں مرحلہ: سائٹ کی شکل و صورت تیار کرنا

اس مرحلے میں آپ سائٹ کی ظاہری شکل و صورت بنانے پر توجہ دیں گے۔ جو رنگوں کے تناسب، تصاویر اور تحریر پر مشتمل ہے اور جو آپ کے پیغام کو اسٹائل کے ساتھ موثر طریقے سے پہنچاتا ہے۔

ذیل میں کچھ عناصر بیان کیے گئے ہیں جن کا سائٹ کی شکل و صورت تیار کرتے ہوئے خیال رکھا جانا ضروری ہے۔

### خالی جگہ اور توازن:

اس سے مراد پیج میں موجود مختلف عناصر کے درمیان خالی جگہ یا سفید پن ہے اور اس میں یہ خیال رکھا جاتا ہے کہ تمام عناصر کس طرح متوازن ہوں گے۔ عام طور پر ڈیزائنر عناصر کے درمیان زیادہ سفید جگہ کو پسند کرتے ہیں کیونکہ اس توازن کی وجہ سے پڑھنے میں آسانی ہوتی ہے۔

### رنگ:

ڈیزائننگ کی ابتدا میں آپ کو یہ پتا ہونا چاہیے کہ کون سے رنگ کس قسم کی ڈیزائننگ میں کیا کردار ادا کرتے ہیں اور یہ آپ کی سائٹ کی خوبصورتی میں کس طرح اضافہ کرتے ہیں۔ اگر آپ ایک ذاتی ہوم پیج بنا رہے ہیں اور زندہ دل شخص ہیں تو گہرے اور شوخ رنگ استعمال کریں جبکہ ایک سنجیدہ موضوع کی ویب سائٹ میں ہلکے رنگ استعمال ہونے چاہئیں۔

### تحریر کے اسٹائل:

رنگوں کی طرح تحریر کے مختلف اسٹائل سائٹ کی خوبصورتی میں اضافہ کرتے ہیں۔ یہ اسٹائل سائٹ کے پیغام کے مطابق ہونے چاہئیں۔ خالی جگہ کی طرح تحریر کے اسٹائل بھی متوازن ہونے چاہئیں۔ آپ ایک پیج میں 20 یا زیادہ اقسام کے اسٹائل استعمال نہیں کر سکتے کیونکہ اس سے پیج پیشہ ورانہ محسوس نہیں ہوتا اور ناظرین اس کو پڑھنے میں پریشانی محسوس کرتے ہیں۔

### شکلیں:

مختلف ویب پیجیز ملاحظہ کرتے ہوئے آپ نے نوٹ کیا ہوگا کہ ان میں بہت سی مستطیلی شکلیں استعمال کی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ شہرت کے لیے جو بینرز استعمال ہوتے ہیں وہ بھی مستطیلی ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں پیج ہیڈرز، بٹن اور دوسرے عناصر بھی استعمال ہوتے ہیں۔ کیونکہ مستطیلی شکلیں کافی عام ہیں اس لیے آپ اس کے علاوہ شکلیں مثلاً تکونیں اور انڈے کی شکل کے دائرے وغیرہ سائٹ میں استعمال کر سکتے ہیں۔ شکلوں کے استعمال سے سائٹ منفرد نظر آتی ہے۔

### ٹیکسچر:

آپ نے اکثر ویب پیجیز کے پس منظر میں ٹیکسچر (texture) کا استعمال دیکھا ہوگا۔ اس ٹیکسچر (texture) میں آپ اپنے نظریات کو استعمال کر سکتے ہیں اور اگر آپ یہ محسوس کرتے ہیں کہ یہ ٹیکسچر (texture) آپ کے نظریات کی

نمائندگی کرے گا تو اسے پیج کے پس منظر میں استعمال کریں۔ ٹیکسچر (texture) استعمال کرنے میں یہ احتیاط کریں کہ اس کے اوپر موجود تحریر بالکل واضح انداز میں پڑھی جاسکے۔

**خاص ایفیکٹس:**

آپ کی سائٹ کو خاص ایفیکٹس مثلاً متحرک منظر (animation) وغیرہ فائدہ پہنچاسکتے ہیں لیکن اس کا خیال رکھیں کہ اس لیے ان کی منصوبہ بندی کریں۔ آپ ایک سائٹ میں بہت زیادہ خاص ایفیکٹس شامل نہیں کرسکتے کیونکہ اس سے سائٹ کی سنجیدگی متاثر ہوتی ہے۔

**مستقل مزاجی:**

یہ ایک ضروری امر ہے کہ سائٹ کے ہر پیج میں مستقل مزاجی موجود ہو۔ سائٹ کے ہر پیج میں رنگوں کا ایک ہی سیٹ استعمال کرنا بھی مستقل مزاجی کے زمرے میں آتا ہے۔ اس کے علاوہ ہر پیج میں آپ ایک ہی طرح کے نیوی گیشن اجزا شامل کرسکتے ہیں۔

**تبدیلی:**

آپ اپنی سائٹ کے نقشے کے مطابق مستقل مزاجی کا خیال رکھتے ہوئے مختلف اقسام کی تبدیلیاں کرسکتے ہیں۔ سائٹ کی شکل وصورت بنانا ڈیزائن کا ایک اہم حصہ ہے۔ بہت سے لوگ پچھلے حصے میں بیان کردہ باتوں کو جانتے ہی نہیں یا جانتے ہوئے بھی ویب پیجز ڈیزائن کرتے ہوئے ان کا خیال نہیں رکھتے جس کے نتیجے میں ان کی سائٹ کی خوبصورتی متاثر ہوتی ہے۔ لیکن آپ ان باتوں کا خیال رکھتے ہوئے ظاہری دلچسپی سے بھرپور پیجز بناسکتے ہیں۔

## پیج کا ڈیزائن

ویب سائٹ کی ڈیزائننگ کرتے ہوئے یہ بات ذہن میں رکھیں کہ ناظرین کی توجہ حاصل کرنے کے لیے آپ کے پاس صرف دو سیکنڈز ہوتے ہیں۔ یعنی آپ کے ویب سائٹ کے ڈیزائن میں اتنی کشش ہونی چاہیے کہ ناظرین دو سیکنڈز کے لیے سائٹ کی طرف دیکھیں تو سائٹ کا ڈیزائن ان کی نظروں کو اپنی گرفت میں لے لے۔۔۔ اگر آپ ذیل میں بیان کردہ نقاط کا خیال رکھیں گے تو یقیناً آپ کا ویب پیج آنکھوں کو گرفت میں لینے کے قابل بن جائے گا۔

☆ سائٹ کے ٹائٹل کو مختصر، آسان، بیانیہ اور درست رکھیں ساتھ ہی اس میں بیان کردہ بات کو پورا کریں۔ مثال کے طور پر اگر آپ کے پیج کا ٹائٹل "Thousands of Yummy Recipes" ہے تو پیج میں کم از کم ہزار طریقے ضرور دیں۔

☆ پیج میں موجود اجزا کی فہرست پیج کے اوپر دیں اور یہ کوشش کریں کہ ناظرین کو فہرست کے حصول کے لیے پیج کو نیچے اسکرول نہ کرنا پڑے۔

☆ اگر آپ کا پیج تین سکرینوں سے بڑا ہے تو اسے ایک سے زیادہ پیجز میں تقسیم کردیں۔

☆ اپنے پیج کو کہیں سے بھی غیر متوازن مت ہونے دیں۔ خالی جگہ، چھوٹی اور بڑی تصویریں، مختلف شکلوں اور تحریر کے باکسز کو اس طرح متوازن کریں کہ پیج میں دلچسپی اور ورائٹی پیدا ہو۔

☆ غیر ضروری اشیا سے پیج کو ہرگز مت بھریں۔

☆ تحریر اور لنکس کو پس منظر کے رنگ کے برعکس رنگ دیں۔

☆ اس بات کا یقین کرلیں کہ ہر وہ چیز جس کو آپ نے لنک کے طور پر استعمال کیا ہے وہ ٹھیک طرح کام کرتی ہے۔

☆ ایک ہی نام سے ایک ہی پیج میں دو ایسے لنکس مت بنائیں جو مختلف جگہوں پر جاتے ہوں اور نہ ہی دو ایسے لنکس مختلف ناموں سے بنائیں جو ایک ہی جگہ پر جاتے ہوں نیز اگر لنک آپ کی سائٹ کے اندر ہی کسی پیج پر جاتا ہے تو ہمیشہ واپس ہوم پیج پر آنے کا ذریعہ ضرور مہیا کریں۔

☆ کوشش کریں کہ آپ جو لنک بنائیں وہ اپنے مقصد کی وضاحت کرتا ہو مثلاً "Click Here to Come in" وغیرہ اور عام طور پر استعمال ہونے والے الفاظ مثلاً "Click Here" وغیرہ استعمال نہ کریں۔

☆ کم جگہ گھیرنے والی تصاویر استعمال کریں۔

☆ بڑی تصویروں کی بجائے ان کے تھمب نیل یا چھوٹی تصاویر بطور لنک استعمال کریں۔

☆ یاد رکھیں کہ آپ کے پیج کے ناظرین مختلف صلاحیت رکھنے والے براؤزر استعمال کرتے ہیں۔

☆ فائل کے ناموں کو مختصر اور مستقل رکھیں۔

☆ جو ڈاؤن لوڈ ہونے والی فائل آپ شامل کرتے ہیں اس کے سائز کے بارے میں ناظرین کو ضرور بتائیں۔

☆ کسی دوسرے کی بنائی گئی تصویروں یا تحریر کو استعمال کرنے سے پہلے اس شخص سے اجازت حاصل کریں اور اپنے ویب پر اس کی تصویر یا تحریر کے ساتھ اس کا حوالہ دیں۔

☆ ویب سائٹ بنانے والے کے ای میل (e-mail) ایڈریس کا لنک ضرور بنائیں۔

**نوٹ:** اوپر بیان کردہ نکات کی روشنی میں آپ ویب سائٹ بنانے کا آغاز پُراعتماد طریقے سے کرسکتے ہیں۔

□□□

درخشاں زرّیں

کوئز

# اردو لسانیات

(1) اردو میں "وضع اصطلاحات" کے لیے ان میں سے کون سا نام سب سے اہم ہے؟

(الف) رشید حسن خاں (ب) وحید الدین سلیم

(ج) امیر اللہ شاہین (د) دتاتریہ کیفی

(2) "دکنی نثر پارے" کے مصنف کا نام ہے۔

(الف) مغنی تبسم (ب) سیدہ جعفر

(ج) شہناز نبی (د) حمرا صدیقی

(3) ان میں سے کون سی کتاب مسعود حسین خاں کی نہیں ہے؟

(الف) مقدمۂ تاریخ زبان اردو

(ب) شعر و زبان

(ج) لسانی مسائل

(د) اردو لفظ کا صوتیاتی اور تجز صوتیاتی مطالعہ

(4) "دونیم" کس ماہر لسانیات کی شعری تخلیق ہے؟

(الف) عصمت جاوید (ب) شوکت سبزواری

(ج) مسعود حسین خان (د) مرزا خلیل احمد بیگ

(5) موجودہ دور میں اردو کا کون سا خط رائج ہے؟

(الف) خطِ نسخ (ب) خطِ تعلیق

(ج) خطِ نستعلیق (د) خطِ عکس

(6) گیان چند جین کی کتاب کا نام کیا ہے؟

(الف) عام لسانیات (ب) لسانی مطالعے

(ج) اردو لسانیات (د) لسانیات ایک مطالعہ

(7) "لسانی مباحث" کس کی تصنیف ہے؟

(الف) سید عبداللہ (ب) خلیل صدیقی

(ج) سلیم اختر (د) شان الحق حقی

(8) "ہندستانی لسانیات اور ہندستانی صوتیات" کس ماہر لسانیات کی کتاب ہے؟

(الف) محی الدین قادری زور (ب) مسعود حسین خاں

(ج) عبدالروف عشرت (د) مرزا خلیل احمد بیگ

(9) "اردو ہندی کے جدید مشترک اوزان" کس کی تصنیف ہے؟

(الف) ڈاکٹر سمیع اللہ اشرفی (ب) کنول کرشن بالی

(ج) کمال احمد صدیقی (د) عنوان چشتی

(10) "نئی اردو قواعد" (اصوات اور صرف ونحو پر تفصیلی گفتگو) کس کی تصنیف ہے؟

(الف) ابواللیث صدیقی (ب) عصمت جاوید

(ج) عبدالحق (د) فتح محمد جالندھری

(11) کس کتاب میں جدید صوتیات اور علم تجوید پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے؟

(الف) لسانی مطالعے (ب) لسانی تناظر

(ج) لسانی مباحث (د) لسانی مسائل

(12) محمود شیرانی اردو زبان کے مولد و مسکن سے بحث کرتے ہوئے جو خوبیاں پنجابی کی بتاتے ہیں وہی خوبیاں مسعود حسین خاں کو کس زبان میں نظر آتی ہیں؟

(الف) برج (ب) ہریانی

(ج) اودھی (د) راجستھانی

(13) اصلاح زبان اردو سے غیر متعلق کون سا نام ہے؟

(الف) شاہ حاتم (ب) خان آرزو

(ج) میر درد (د) مظہر جان جاناں

(14) نصیر الدین ہاشمی کی کتاب کا نام کیا ہے؟

(الف) دکن میں اردو (ب) دکنی اردو

(ج) دکنی ادب کی تاریخ (د) اردو دکن میں

(15) کس نے دکنی ادب کی تاریخ لکھی ہے؟

(الف) عبدالحق (ب) رام بابو سکسینہ

(ج) محی الدین قادری زور (د) سیدہ جعفر

(16) اسلوبیات کا مطالعہ لسانیات کی کس شاخ میں کیا جاتا ہے؟

(الف) تاریخی لسانیات (ب) تقابلی لسانیات

(ج) توضیحی لسانیات (د) اطلاقی لسانیات

(17) زبان کا وہ کون سا نظریہ ہے جس کے مطابق حالت جذبات میں انسان کے منھ سے نکلنے والی آوازیں ہی پہلے پہل زبان کے لیے محرک ثابت ہوئیں؟

(الف) اجتماعی محنت کا نظریہ (ب) فطری نظریہ

(ج) فجائی نظریہ (د) اشارات و حرکات کا نظریہ

(18) لسانیات کی کس شاخ میں کسی زبان کی آوازوں کے مخارج سے بحث کی جاتی ہے۔

(الف) علم زبان (ب) صوتیات
(ج) صوتیے (د) فونیمیات

(19) مارفولوجی کس علم کا اصطلاحی نام ہے؟
(الف) علم صرف (ب) علم نحو
(ج) علم زبان (د) علم بیان

(20) صوت تانت (لب) کسے کہتے ہیں؟
(الف) نرم تالو سے جڑے حصے کو
(ب) ایسے دو حرکت کرنے والے پردے کو جو جبڑے میں لگے ہوتے ہیں۔
(ج) حلقوم کو
(د) زبان کے پچھلے حصے کو

(21) ایسی آوازیں جن کو ادا کرتے وقت صوت تانت زوروں سے تھرتھراتے ہیں، کیا کہتے ہیں؟
(الف) بندشی (ب) جہری
(ج) مسموع (د) غیر مسموع

(22) مسموع آواز کی نمائندگی کرنے والا حرف کون ہے؟
(الف) پ (ب) ب
(ج) م (د) ث

(23) منھ سے آواز ادا کرنے میں سب سے اہم کام کس کا ہوتا ہے؟
(الف) نرم تالو کا
(ب) سخت تالو کا
(ج) پھیپھڑے سے آنے والی ہواؤں کا
(د) ناک کا

(24) اردو کی کرخنداری بولیوں پر کس ماہر لسانیات کا کام اہم تصور کیا جاتا ہے؟
(الف) سہیل بخاری (ب) مسعود حسین خاں
(ج) نصیر احمد خاں (د) شوکت سبزواری

(25) حلقائی آوازیں کسے کہتے ہیں؟
(الف) حلق سے بننے والی آوازوں کو
(ب) نرم تالو سے بننے والی آوازوں کو
(ج) سخت تالو سے بننے والی آوازوں کو
(د) ایسی آوازوں کو جن میں ہوا ناک کے راستے باہر نکلتی ہے

(26) انفی آواز اس کو کہتے ہیں جس کو ادا کرتے وقت......
(الف) ہوا ناک کے راستے باہر جائے
(ب) ہوا منھ کے راستے باہر جائے
(ج) ہوا مسوڑھوں سے ٹکرا کر باہر نکلے
(د) ہوا منھ اور ناک دونوں سے ایک ساتھ نکلے

(27) فونیمیات میں کن چیزوں سے بحث کی جاتی ہے؟
(الف) کسی زبان کی تفاعلی اکائیوں سے
(ب) کسی زبان کی تمام آوازوں سے
(ج) کسی زبان کی طرز ادائیگی سے
(د) کسی زبان کے ہم صوت الفاظ سے

(28) ان میں معکوسی آواز کی نمائندگی کون حرف کرتا ہے؟
(الف) د (ب) ڈ
(ج) س (د) ر

(29) 'س' کس آواز کی نمائندگی کرتی ہے؟
(الف) صفیری (ب) بندشی
(ج) پہلوئی (د) انفی

(30) پہلوئی آواز کی نمائندگی کون سا حرف کرتا ہے؟
(الف) ب (ب) ر
(ج) ل (د) م

(31) وہ آواز جس کو ادا کرتے وقت سانس کی ہوا زبان کے کسی حصے سے بغیر رگڑ کھائے باہر نکل جاتی ہے؟
(الف) مصوتہ (ب) مصمتہ
(ج) افریکیٹ (د) ان میں سے کوئی نہیں

(32) وہ آواز جس کو ادا کرتے وقت سانس کی ہوا زبان کے کسی بھی حصے سے رگڑ کھا جائے......
(الف) مصوتہ (ب) مصمتہ
(ج) ارتعاشیہ (د) افریکیٹ

(33) چھوٹے سے چھوٹے اور بامعنی لسانی ٹکڑے کو لسانی اصطلاح میں کہتے ہیں......
(الف) فونیم (ب) مارفیم
(ج) مارف (د) صوت رکن

(34) اگر کسی ترکیب کو صرف دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکے تو وہ حصے کیا کہلائیں گے؟
(الف) جزو ترکیب (ب) جزو متصل
(ج) کثیر اجزا (د) جزو مسلسل

(35) اردو زبان میں "بل" (Stress) کون حیثیت رکھتا ہے؟
(الف) فونیمی (ب) صرفیاتی

(ج) صوتیاتی　　(د) نحویاتی

(36) زبان میں سرلہر(Intonation) کا کیا کام ہوتا ہے؟

(الف) اس سے زبان کی ادائیگی میں آسانی ہوتی ہے

(ب) اس سے لہجے کی تبدیلی اور اتار چڑھاؤ کا پتہ چلتا ہے

(ج) اس سے حلقی آوازوں کی ادائیگی میں آسانی ہوتی ہے

(د) اس سے گانے میں آسانی ہوتی ہے

(37) دنیا کی تمام زبانوں کو قواعدی بناوٹ کے اعتبار سے عموماً کتنے حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے؟

(الف) دو　　(ب) تین

(ج) چار　　(د) ان میں سے کوئی نہیں

(38) محی الدین قادری زور نے اپنی کتاب "ہندستانی لسانیات" میں دنیا کی تمام زبانوں کو کتنے حصوں میں تقسیم کیا ہے؟

(الف) سات　　(ب) آٹھ

(ج) چار　　(د) چھ

(39) "اردو کیسے لکھیں" یہ کس کی کتاب ہے؟

(الف) میر قاسم　　(ب) رشید حسن خاں

(ج) فرمان فتح پوری　　(د) گوپی چند نارنگ

(40) دراوڑی خاندان کی زبانیں ہندستان کے کس حصے میں بولی جاتی ہیں؟

(الف) جنوب مغرب　　(ب) جنوب وسط

(ج) جنوب　　(د) جنوب مشرق

(41) ہندستان کے مشرق میں کس زبان کے خاندان کا زیادہ اثر ہے؟

(الف) دراوڑی　　(ب) ہند آریائی

(ج) ہند چینی　　(د) سامی

(42) سندھی زبان کس رسم خط میں لکھی جاتی ہے؟

(الف) لہندا یا فارسی　　(ب) لہندا یا عربی

(ج) عربی فارسی　　(د) گورمکھی

(43) "ہندستانی گرامر" کس کی کتاب ہے؟

(الف) ہیڈلے　　(ب) کال برک

(ج) گریرسن　　(د) جان گل کرسٹ

(44) پنجابی کا رسم خط کیا ہے؟

(الف) گورمکھی　　(ب) لہندا

(ج) پنجابی　　(د) پشاچہ

(45) دراوڑی خاندان کی کس زبان کا تعلق شمال مغرب سے رہا ہے؟

(الف) تامل　　(ب) کنڑ

(ج) براہوی　　(د) تیلگو

(46) ملتانی زبان کس زبان کی شاخ سمجھی جاتی ہے؟

(الف) پنجابی　　(ب) سندھی

(ج) لاہوری　　(د) ہریانی

(47) ہندستان میں بسنے والے عربی النسل قبائل، مرکیار، راؤتھر اور چولیا کی مادری زبان کیا ہے؟

(الف) تامل　　(ب) کنڑ

(ج) ملیالم　　(د) عربی

Research Scholar,
Department of Urdu, Darbhanga House,
Patna University, Patna-800005 (BIHAR)

□□□

ڈاکٹر حامدی کاشمیری

میر تقی میر کی شاعری کا منظر نامہ شخصی زندگی کی حدوں کو سمیٹتا ہوا ایک آفاقی انسانی صورت حال کو ابھارتا ہے جس میں سایوں اور روشنیوں کی ایک طلسمی دنیا آباد ہے۔

دوسری اشاعت

255 صفحات قیمت: 62 روپے

سیّد احتشام حسین

بچوں کی تعلیمی ضروریات نیز تعلیم بالغاں کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر اس طرح لکھی گئی ہے کہ اردو زبان و ادب کی تاریخ ابتدا سے موجودہ دور تک ایک تسلسل کے ساتھ سامنے آ جائے۔ کتاب میں اہل قلم کی 61 تصویریں بھی ہیں۔

دوسرا ایڈیشن

104 صفحات قیمت: 21 روپے

پروفیسر ساجدہ زیدی

علم النفسیات کا سب سے اہم پہلو شخصیت کی نفسیات ہے۔ اس کتاب میں انسانی شخصیت کے کرداری تجزیے کی جبلی، فعلی اور امکانی عناصر اور ان کی نمو پذیر شخصیت کی پردہ کشائی کی کوشش کی گئی ہے۔

پہلی اشاعت

456 صفحات　　قیمت 123 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر.کے. پورم، نئی دہلی-110066

فیروز عالم

کمپیوٹر سینٹر کے فارغ طلبہ کے انٹرویو-13

# بڑھتے قدم

**مختار احمد** نے، جن کے والد ٹیچر ہیں، ابتدائی تعلیم اپنے علاقے مومن آباد، اسلام آباد، کشمیر کے سرکاری اسکول میں حاصل کی اور اس کے بعد بی.اے. پھر ایم.اے. کیا۔ ایم.اے. کے دوران ہی انہوں نے کونسل کا ایک سالہ ڈپلوما اِن کمپیوٹر ایپلی کیشن اینڈ ملٹی لنگول ڈی.ٹی.پی. کورس کیا اور اس کورس کی وجہ سے انہیں اپنے پروفیشنل کیرئیر میں کافی ترقی مل رہی ہے، ان کا مختصر انٹرویو قارئین "اردو دنیا" کے لیے پیش ہے۔

سوال: کمپیوٹر سے آپ کو کیسے دلچسپی ہوئی؟

جواب: کمپیوٹر سینٹر میں داخلہ لینے سے قبل مجھے اس سے بہت زیادہ دلچسپی نہیں تھی، میری دلچسپی کمپیوٹر سینٹر میں ایڈمشن لینے کے بعد شروع ہوئی اور یہی دلچسپی مجھے کامیابی کی راہ دکھاتی گئی۔

سوال: قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹر دوسرے سینٹروں سے کس اعتبار سے مختلف ہیں؟

جواب: کمپیوٹر کی تعلیم، خاص طور سے اردو پیکیجز کی تعلیم اور مکمل تربیت، بہت کم خرچ پر اور ماہر اساتذہ کے ذریعے دی جاتی ہے۔ یہ کونسل کے کمپیوٹر سینٹروں کی سب سے بڑی خوبی ہے۔

سوال: قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹروں میں جو تربیت دی جا رہی ہے، اُس سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟

جواب: پوری طرح مطمئن ہوں، طرزِ تعلیم، تعلیم کے لیے مہیا مواد اور دستیاب پروگرام اس کافی ممد و معاون ہیں، ساتھ ہی ساتھ اساتذہ بھی مخلص اور ماہر ہیں۔

سوال: قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹر اُردو داں طبقے کو روزگار فراہم کرانے میں کس حد تک معاون ہیں؟

جواب: یہ ڈپلوما آج ذریعۂ معاش تلاش کرنے میں کافی مددگار ثابت ہو رہا ہے اور یہ اردو طبقے کے لیے فخر کی بات ہے، کیونکہ صرف اس ڈپلوما کی بنا پر ہم نہ صرف یہ کہ نوکری تلاش کرنے میں کامیاب ہو رہے ہیں بلکہ بسا اوقات ہمیں دوسروں پر فوقیت دی جاتی ہے۔

سوال: انفارمیشن ٹیکنالوجی کی دنیا کا حصہ بن کر آپ کو کیسا لگ رہا ہے؟

جواب: کافی اچھا لگ رہا ہے، جی چاہتا ہے اسی میدان کا ایک جزو خاص بن جاؤں اور اس راہ میں جس حد تک ممکن ہو، آگے بڑھتا رہوں۔

سوال: اس میدان میں آنے کے بعد کیا آپ میں کوئی بدلاؤ آیا ہے؟ کیا آپ کی خود اعتمادی اور خود انحصاری میں اضافہ ہوا ہے؟

جواب: بہت زیادہ اضافہ ہوا ہے، میں جو کل تک اس دنیا کو عجوبے کی شکل میں دیکھتا تھا آج اس کا نہ صرف یہ کہ ایک حصہ بن گیا ہوں بلکہ مجھے اس کورس نے وہ خود اعتمادی بخشی ہے کہ آج میں کسی بھی جگہ اپنے آپ کو کسی سے کمتر محسوس نہیں کرتا۔

سوال: آپ لازمی طور پر ملٹی لنگول ہیں۔ یہ آپ کے لیے ایک بے حد مثبت چیز ہے۔ آپ اپنی اس خصوصیت کی بنا پر مارکیٹ میں اپنے آپ کو کس مقام پر پاتے ہیں؟

جواب: ایک ایسے مقام پر جہاں میرے سامنے کئی دروازے کھلے ہوئے ہیں یعنی بہتر مقام پر پاتا ہوں۔

سوال: آپ نے کمپیوٹر سینٹر میں جو فیس ادا کی، وہ آپ کے لیے بوجھ تو نہ تھی؟

جواب: بالکل نہیں، قطعی نہیں۔

□□□

## جوابات: کوئز

| | | | | | |
|---|---|---|---|---|---|
| 1.ب | 2.ب | 3.ج | 4.ج | 5.ج | 6.ب |
| 7.ب | 8.الف | 9.الف | 10.ب | 11.ب | 12.ب |
| 13.ج | 14.الف | 15.ج | 16.د | 17.ج | 18.ب |
| 19.الف | 20.ب | 21.ج | 22.ب | 23.ج | 24.ج |
| 25.ب | 26.الف | 27.الف | 28.ب | 29.الف | 30.ج |
| 31.الف | 32.ب | 33.ب | 34.ب | 35.ج | 36.ب |
| 37.الف | 38.ب | 39.ب | 40.ب | 41.ج | 42.ب |
| 43.د | 44.الف | 45.ج | 46.ب | 47.الف | |

# اردو خبر نامہ

## امریکہ میں سہ روزہ عالمی اردو کانفرنس

● نیوجرسی، 3 جون۔ امریکہ کے شہر نیوجرسی میں 4 تا 6 جون کو منعقدہ سہ روزہ عالمی اردو کانفرنس اپنی نوعیت کی پہلی کانفرنس تھی جس میں مختلف ممالک کے اردو ادیب، نقاد، ڈرامہ نگار، صحیفہ نگار اور شعرا شریک ہوئے۔ اس کانفرنس میں امریکہ کی مختلف ریاستوں نیویارک، ایلی نوائز، ٹکساس، کیلی فورنیا، میری لینڈ وغیرہ کے علاوہ ہندستان، پاکستان، برطانیہ اور کینیڈا سے بھی مہمان مقررین اور مندوبین شریک ہوئے۔

کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اردو زبان کی تاریخ اور اس کی مقبولیت، اردو ادیبوں اور شاعروں کی خدمات پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ اردو زبان کو ایک خصوصی مذہب کے ماننے والوں سے منسوب کرنا اردو زبان پر ظلم ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کہا کہ بھلے ہی اردو نے نامور مسلم ادیب، شاعر، مرثیہ نگار اور ڈرامہ نگار پیدا کیے ہوں لیکن اس میں غیر مسلم افراد کی فہرست بھی مختصر نہیں ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس زبان کا نہ صرف تحفظ کیا جائے بلکہ آنے والی نسلوں تک اس کو پہنچانے کا انتظام کیا جائے۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن عبد (نیویارک) نے استقبالیہ خطبہ پیش کیا اور ڈاکٹر تقی عابدی (ٹورنٹو) نے افتتاحی کلمات میں اردو کانفرنس کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی۔

کانفرنس کے دوسرے دن ادبی میلہ اور کتابوں کی نمائش کا افتتاح عمل میں آیا۔ پہلا اجلاس ''اردو زبان اور تنقید نگاری'' کے عنوان پر تھا جس کی صدارت پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کی اور حمایت علی شاعر نے اپنا مقالہ پیش کیا۔ دوسرا اجلاس اقبالیات پر ڈاکٹر سہیل عمر، ناظم اقبال اکادمی کی زیر صدارت منعقد ہوا۔ تیسرا اجلاس زیر صدارت جناب محسن احسان (پاکستان) بعنوان ''لغت اور اردو ادبیات'' منعقد ہوا۔ چوتھا اجلاس اردو زبان توسیعی و ترسیلی مسائل پر منعقد ہوا۔

تیسرے اور آخری دن 6 جون کو صبح ''اردو فکشن ڈرامہ، افسانہ اور ناول'' کے زیر عنوان اجلاس ہوا جس کی صدارت امجد اسلام امجد نے کی۔ محترمہ نیلوفر عباس اور رضا علی عابدی نے اپنے مقالے پیش کیے پھر ''اردو مرثیے میں ادب کے ارتقائی اقدار'' پر اجلاس ڈاکٹر ڈیوڈ میتھوز (لندن) کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر میتھوز لندن یونیورسٹی میں گذشتہ 30 برس سے اردو کے تدریسی فرائض انجام دے رہے ہیں۔

اردو صحافت اور عصری تقاضے کے زیر عنوان منعقدہ اجلاس کی صدارت جناب زاہد علی خاں ایڈیٹر روزنامہ ''سیاست'' (حیدرآباد) نے کی۔ اس اجلاس میں قمر علی عباسی (نیویارک) اور سابق سفیر کرامت اللہ غوری نے اپنے مقالے پیش کیے۔ بعد ازاں ''اردو کی نئی بستیاں— شمالی امریکہ اور یورپ'' کے عنوان سے جناب رضا علی عابدی (بی بی سی، لندن) کی صدارت میں اجلاس ہوا جس میں مقالہ نگاروں اور خود صدر جلسہ نے امریکہ اور یورپ میں اردو کی ترقی اور اس کی مقبولیت پر روشنی ڈالی۔

آخر میں عالمی مشاعرے پر سہ روزہ کانفرنس کا اختتام عمل میں آیا۔ ممتاز شاعر جناب شان الحق حقی نے مشاعرے کی صدارت کی۔ مشاعرے میں حمایت علی شاعر، امجد اسلام امجد، محسن احسان کے علاوہ ڈاکٹر عابد اللہ غازی (شکاگو)، خالد فرحان (نیویارک)، اطہر رضوی (کینیڈا)، عرفان مرتضیٰ، شمیم رجز (کیلی فورنیا) محترمہ رشیدہ جہاں اور دوسروں نے کلام پیش کیا۔ محترمہ ریحانہ قمر نے مشاعرے کی نظامت کے فرائض انجام دیے۔ شکاگو سے جن ادیبوں اور شاعروں نے اس سہ روزہ کانفرنس میں شرکت کی ان میں ناول نگار رضیہ فصیح احمد، شاعر رشید شیخ، ڈاکٹر عابد اللہ غازی ڈائرکٹر اقرا فاؤنڈیشن، صحافی ڈاکٹر حمید اللہ خان اور خواجہ طارق بیورو چیف ''اردو ٹائمز'' شامل تھے۔ (سیاست، حیدرآباد)

## غالب انسٹی ٹیوٹ میں منشی ہرگوپال تفتہ پر سیمنار

● نئی دہلی، 21 جون۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام غالب کے معاصر و شاگرد منشی ہرگوپال تفتہ سیمنار کے موقعے پر ہریانہ کے سابق گورنر جناب سید مظفر حسین برنی نے اپنی افتتاحی تقریر میں منشی ہرگوپال تفتہ کی شاعری پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ تفتہ کی فارسی شاعری کو اس دور میں زیادہ سے زیادہ منظر عام پر لانے کی ضرورت ہے کیونکہ اُن کے فارسی اشعار کے مطالعے سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا مطالعہ وسیع تھا اور انھیں فارسی سے والہانہ عشق تھا۔ برنی صاحب نے اس بات پر بھی افسوس کا اظہار کیا کہ 50 ہزار سے زیادہ اشعار کہنے والے اس شاعر کو اتنی شہرت نہ ملی، جس کا وہ مستحق تھا۔ اس سے پہلے غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر جناب شاہد ماہلی نے اپنی استقبالیہ تقریر میں سیمنار کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی۔ جناب سید امیر حسن عابدی نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ تفتہ کے فارسی آثار پر کام کی کافی گنجائش ہے اور اس طرح کے سیمنار سے ہمیں

نہ صرف شاعر کے حالاتِ زندگی اور شاعری کو بلکہ اُس عہد کی تہذیب کو سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ اس موقعے پر غالب انسٹی ٹیوٹ نے کل ہند مضمون نگاری کے انعامات کی بھی تقسیم کی، جسے" غالب شناسی کے معمار" کے عنوان سے منعقد کرایا گیا تھا۔ محمد شہاب الدین (حیدرآباد) کو پہلا انعام، رضاء الرحمٰن عاکف کو دوسرا انعام اور محترمہ شاذیہ عمیر پٹنہ یونیورسٹی) اور جاوید رحمانی (جے این یو) کو تیسرا انعام دیا گیا۔ پہلے اجلاس کی نظامت ڈاکٹر رضا حیدر نے کی اور جناب علیم اشرف نے" منشی ہرگوپال تفتہ کا دیوانِ دوم ایک تعارف" ڈاکٹر عراق رضا زیدی نے" تفتہ کی فارسی شاعری اور تاریخ گوئی" پروفیسر شعیب اعظمی نے" غالب اور تفتہ" اور ڈاکٹر کمال احمد صدیقی نے" تفتہ کچھ تاثرات" کے عنوان سے مقالے پیش کیے۔ دوسرے اجلاس میں پروفیسر شریف حسین قاسمی نے" سنبلستان اور تفتہ کے آثار" ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری نے" تفتہ کے کلام پر غالب کی اصلاحیں" اور پروفیسر احسن الظفر نے" تفتہ کا فارسی کلام" کے زیرِ عنوان مقالے پیش کیے۔ اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر وسیم بیگم نے کی۔ سمینار میں دلی کی تینوں یونیورسٹیوں کے اساتذہ، ریسرچ اسکالرز اور بڑی تعداد میں اہلِ علم و ادب موجود تھے۔ آخر میں شاہد ماہلی نے تمام سامعین کا شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

## "نظیر — فن اور شخصیت" سمینار

● جودھپور، 4/اپریل۔ نظیر کی نظموں کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے حالانکہ ان کی غزلیں بھی دلچسپ ہیں اور ان کی جانب بھی سنجیدگی سے توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ ان خیالات کا اظہار راجستھان اردو اکادمی کے سابق وائس چیئرمین اے۔ڈی۔راہی نے 'نظیر — فن اور شخصیت' سمینار میں کیا۔ مہمانِ خصوصی لیاقت اللہ خاں نے نظیر کی خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے عام انسان کی زندگی کی مشکلوں کو خوبصورت انداز میں پیش کیا۔

بزمِ اردو، جودھپور کے زیرِ اہتمام 'ڈاکٹر مدن ڈاگا ساہتیہ بھون' میں منعقد اس سمینار میں ڈاکٹر نثار راہی نے 'نظیر کی اہمیت' کے عنوان سے مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ نظیر کی شاعری جینے کا ہنر سکھاتی ہے اور مایوسی میں امید کی کرن بن کر جگمگاتی ہے۔ اشراق الاسلام ماہر نے 'اردو نظم کے ناظم۔نظیر' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔ برجیش عنبر نے کہا کہ تذکرہ نگاروں نے نظیر کو زیادہ اہمیت نہیں دی۔ ڈاکٹر اے۔ زیڈ عابدی نے اپنے مقالے 'عوام دوست نظیر' میں نظیر کی نظموں ہولی، دیوالی، عید وغیرہ کا تنقیدی تجزیہ پیش کیا۔ ایوب خاں نے 'نظیر کی شعری کائنات' کے زیرِ عنوان مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ نظیر کی شاعری میں زندگی کے تمام رنگ ملتے ہیں۔ سمینار کے آغاز میں وشال پروہت نے نظیر کی چند نظمیں پیش کیں۔ اس موقعے پر کرشن موہن، عنوان چشتی، مشکور جاوید، پارس رومانی اور شوکت علی عابدی کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔ سمینار میں مشہور شاعر اور نقاد شین۔کاف۔نظام، ڈاکٹر فرید آفریدی، پروفیسر ایم۔ایم۔ماتھر، سرفراز شاکر، افضل جودھپوری اور دیگر ادب دوست حضرات موجود تھے۔ آخر میں بزم کے سرپرست امر چند پروہت نے شکریہ ادا کیا۔ نظامت مظاہر سلطان زئی نے کی۔

(ڈاک سے)

## یومِ اقبال

● جودھپور۔ بزمِ اردو، جودھپور کی طرف سے یومِ اقبال پر" یادِ اقبال" کے عنوان سے ایک ادبی محفل منعقد کی گئی جس میں ممتاز شاعر جناب ش۔ک۔نظام نے صدارتی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ شاعر آسان سے مشکل اور مشکل سے آسان زبان میں شعر کیوں کہتا ہے۔ غالب اور اقبال کے حوالے سے اس کے متعلق غور و فکر کی ضرورت ہے۔ انھوں نے اقبال کی مشہور نظم ترانۂ ہندی کا تحقیقی جائزہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ مختلف متون میں اس کے اشعار مختلف ہیں۔ انھوں نے اقبال کو ایک مجتہد قرار دیا۔ مہمانِ خصوصی ڈاکٹر فرید آفریدی نے 'اقبال شاعر اور شخصیت' کے عنوان سے مقالہ پیش کرتے ہوئے اقبال کے فلسفے اور شاعری پر مفصل گفتگو کی۔ اشراق الاسلام ماہر نے 'اقبال کی زبان، فکر اور قارئینِ اقبال' مولانا سلیمان احمد ندوی نے 'اقبال کا تحت الشعور' اور سرفراز شاکر نے 'اقبال کا مقصدِ شاعری' کے زیرِ عنوان اپنے مقالے پیش کیے۔ وشال پروہت نے اقبال کے حالاتِ زندگی اور فلسفہ و شاعری کی خصوصیات بیان کیں۔ آغاز میں راجستھان اردو اکادمی کے سابق وائس چیئرمین اے۔ڈی۔راہی نے استقبالیہ تقریر کی۔ بحث میں سکھ دیو ویاس، محمد سلیم نے حصہ لیا۔ اس موقعے پر عرفان صدیقی اور کومل کوٹھاری کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔ سمینار میں پروفیسر کنھیا لال راج پروہت، حبیب کیفی، ساغر القادری، افضل جودھپوری، برجیش عنبر موجود تھے۔ بزم کے سرپرست امر چند پروہت نے شکریہ ادا کیا۔ نظامت مظاہر سلطان زئی نے کی۔

(ڈاک سے)

## محفلِ خواتین کا ادبی اجلاس

● حیدرآباد، 18/جون۔" با مقصد ادبی تخلیقات انسان کے ضمیر کو بیدار اور روح کو شاد کرتی ہیں اور کسی نہ کسی انداز میں اصلاحِ معاشرہ کا باعث ہوتی ہیں۔" ان خیالات کا اظہار پروفیسر نجمہ سجاد ظہیر، ڈین اسکول آف لائف سائنسیز، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی نے 12/جون کو کالج آف سوشل ویلفیئر میں محفلِ خواتین کے ماہانہ ادبی اجلاس میں صدارتی تقریر کرتے ہوئے کیا۔ مہمانانِ خصوصی کی حیثیت سے شریمتی لکشمی دیوی راج اور پروفیسر قادری بیگم رضوی نے شرکت کی۔ محترمہ عزیز النساء صبا نے نظامت کے فرائض انجام

دیے۔ محترمہ شبینہ اسلم قریشی نے افسانہ "کون طے کس کو" پیش کیا۔ محترمہ فریدہ راج نے "لغزش اور مداوا" کے زیرِ عنوان ایک حقیقی واقعہ گوش گزار کیا۔ محترمہ عزیزہ محبوب نے اپنے مختصر طنزیہ مضمون "مرد ہو تو ایسا" میں آج کل کے مردوں کی خصوصیات پر روشنی ڈالی۔ پروفیسر نجمہ سجاد ظہیر نے حب الوطنی پر مبنی اپنی والدہ کی تصنیف کردہ کہانی "نمک" سنائی۔ بزمِ مشاعرہ میں محفل خواتین سے وابستہ شاعرات محترمہ عزیز النسا صبا، محترمہ نسیمہ تراب الحسن، محترمہ مظفر النسا ناز، محترمہ عزیزہ محبوب، محترمہ نسیم نیازی، محترمہ خالدہ بسم اللہ خاں، محترمہ حنا شہیدی، محترمہ شرف شہریار کاظمی، محترمہ تسنیم جوہر اور سیدہ انور حیدرالدین نے کلام سنایا۔ مشاعرے کی نظامت محترمہ مظفر النسا ناز نے کی۔ اس محفل کی داعی پروفیسر حبیب ضیا اور پروفیسر بشیر النسا تھیں۔ (منصف، حیدرآباد)

## اردو، مراٹھی غزل ورکشاپ

● ممبئی، 2/جون۔ مراٹھی زبان میں صنفِ غزل کی مقبولیت کے پیشِ نظر مراٹھی غزل گو شعرا کو اردو مراٹھی بحروں سے روشناس کرانے کے لیے مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی، غزل ساگر پرتشٹھان اور یشونت راؤ چوہان پرتشٹھان، ممبئی کی جانب سے ایک روزہ ورکشاپ کا انعقاد کیا گیا۔ جس میں احمد وصی، ڈاکٹر رام پنڈت، بھیم راؤ پانچالے، سنگیتا جوشی اور شیواجی زورے نے اردو بحروں اور مراٹھی چھندوں سے مراٹھی غزل گو شعرا کو متعارف کرایا۔

اس موقعے پر مہاراشٹر اردو ساہتیہ اکادمی کی جانب سے بھیم راؤ پانچالے کو ستو مادھوراؤ پگڑی مراٹھی اردو خدمات کا انعام دیے جانے پر اکادمی کے ایگزیکیٹو چیئرمین ساجد رشید کے ہاتھوں شال، سرٹیفکیٹ اور مبلغ پندرہ ہزار روپیوں کا چیک پیش کیا گیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر رام پنڈت کی پانچ کتابوں "مرزا غالب" (غالب پر مراٹھی مضامین) "احساس" (اردو شعری مجموعہ) "میر" (میر تقی میر کے منتخب اشعار کے منظوم تراجم) "غزلی کا" (مراٹھی شعری مجموعہ) اور "مہاراشٹر میں اردو غزل" (مہاراشٹر کے شعرا کا انتخاب) کی رسمِ اجرا ڈاکٹر عبدالستار دلوی اور قیصر الجعفری کے ہاتھوں عمل میں آئی۔

ریاستی زبان مراٹھی اور اردو کو قریب لانے کی اسکیم کے تحت ڈاکٹر عبدالستار دلوی کی صدارت میں اردو مراٹھی مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس میں قیصر الجعفری، یعقوب راہی، احمد وصی، مختار احسن انصاری، عبدالاحد ساز، سعید راہی، رام پنڈت، سنگیتا جوشی، اے۔ کے۔ شیخ، ملیتا باکھیا، ظہیر شیخ، مادھو ڈولے وغیرہ شعرا کرام نے اپنا کلام پیش کیا۔ وقار قادری نے جلسے کی نظامت کی۔ (ڈاک سے)

## اردو یونیورسٹی میں پی۔جی۔ سطح پر کیمپس تعلیم کا آغاز

● حیدرآباد، 22/جون۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے رواں تعلیمی سال سے پوسٹ گریجویٹ سطح پر کیمپس طریقۂ تعلیم کا آغاز کرتے ہوئے پانچ پی۔جی۔ کورسوں میں داخلوں کا اعلان کیا ہے جن میں دو پیشہ ورانہ کورسیز بھی شامل ہیں۔ ریگولر کورسیز کے علاوہ فاصلاتی طرز میں رواں تعلیمی سال سے ایم۔اے۔ اردو بھی شروع کیا جائے گا۔ یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر اے۔ایم۔ پٹھان نے یہ اطلاع دیتے ہوئے بتایا کہ یونیورسٹی میں اردو، انگریزی، ہندی، ماس کمیونیکیشن اور بزنس ایڈمنسٹریشن میں ایم۔اے۔ کورسیز کا آغاز کیا جارہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ بین لسانی رابطے کو بڑھانے کے لیے اردو یونیورسٹی کی جانب سے ایم۔اے۔ ہندی اور ایم۔اے۔ انگریزی کا کورس شروع کیا گیا ہے۔ پروفیسر پٹھان نے مزید کہا کہ کیمپس طریقۂ تعلیم میں شروع کیے جانے والے ہر ایک کورس میں طلبہ کی تعداد 40 ہوگی۔ مذکورہ 5 پوسٹ گریجویٹ کورسیز کی تعلیم کا آغاز 13/ستمبر سے ہوگا۔ (ڈاک سے)

## اردو کے مسائل پر قراردادوں کی منظوری

● گلبرگہ، 6/جنوری۔ انجمن ترقی اردو ہند (شاخ) گلبرگہ کی مجلسِ عام کا سالانہ اجلاس 6/جون کو "خواجہ بندہ نواز ایوانِ اردو" میں زیرِ صدارت جناب ایم۔اے۔ عظیم (صدر انجمن) منعقد ہوا۔ ابتدا میں جناب خواجہ پاشا انعامدار (شریکِ معتمد) نے انجمن کی سرگرمیوں پر مشتمل رپورٹ پیش کی۔ جس میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی طرف سے قائم انجمن کے کمپیوٹر سینٹر کی سرگرمیوں پر بھی روشنی ڈالی گئی۔ کمپیوٹر سینٹر کی پیش رفت اور طلبہ کی امتیازی کامیابی پر اطمینان کا اظہار کیا گیا۔

جناب شریف احمد قریشی، ڈاکٹر حشمت فاتحہ خوانی، پروفیسر محمد ہاشم علی، جناب قاسم شاہ پوری اور جناب امجد جاوید نے انجمن ترقی اردو ہند (شاخ) گلبرگہ کے لائحۂ عمل پر اظہار خیال کرتے ہوئے انجمن کے ترقیاتی پروگراموں کو آگے بڑھانے پر زور دیا، نیز متحدہ طور پر اردو کی سرگرمیوں کو فروغ دینے کے سلسلے میں مفید تجاویز پیش کیں۔ ارکانِ عام کی جانب سے پیش کردہ قراردادوں کو جناب وہاب عندلیب نے منظوری کے لیے مجلسِ عام میں پیش کیا۔ ان قراردادوں پر جناب شریف احمد قریشی، جناب امجد جاوید، جناب قاسم شاہ پوری، جناب ایم۔اے۔ عظیم اور جناب وہاب عندلیب نے اظہار خیال کیا اور متفقہ طور پر حسبِ ذیل قراردادیں منظور کی گئیں۔

☆ انجمن ترقی اردو ہند (شاخ) گلبرگہ کی مجلسِ عام کا یہ اجلاس سررشتۂ تعلیمات حکومت کرناٹک سے مطالبہ کرتا ہے کہ سرکاری و امدادی پرائمری و سیکنڈری اسکولوں میں اردو اساتذہ کی جو اسامیاں خالی ہیں انھیں فی الفور پُر کیا جائے اور تقررات کے سلسلے میں گریجویشن کی سطح پر امیدواروں کے لیے جو دو سماجی علوم کا لزوم عائد کیا گیا ہے اسے کالعدم قرار دیا جائے۔

☆ یہ اجلاس اردو پرائمری اور سیکنڈری اسکولوں کی نصابی کتابوں کی عدم دستیابی پر اپنے گہرے افسوس کا اظہار کرتا ہے اور سررشتۂ DSERT حکومت کرناٹک سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ جماعت اوّل تا ہم ترجیحی طور پر فوری نصابی کتاب فراہم کرے کیوں کہ مدارس میں نہ صرف کلاسیں شروع ہو چکی ہیں بلکہ اساتذہ نصابی کتابوں کی عدم دستیابی پر بے چینی کا اظہار کر رہے ہیں۔

☆ مجلسِ عام کا احساس ہے کہ حکومت کرناٹک نے حال میں لسانی اقلیتوں کے سلسلے میں جس اہم سرکلر سے دست برداری اختیار کی ہے وہ نہ صرف دستوری تیقنات سے انحراف ہے بلکہ اس سے لسانی اقلیتیں اپنی زبان کی ترویج و ترقی کے دستوری حق سے محروم ہوں گی۔ جس سرکاری حکم نامے کی دستبرداری کا چرچا ہے وہ یہ کہ لسانی کمشنر کی سفارش پر ریاستی حکومتیں ملک کے مختلف حصوں میں جہاں اقلیتوں کی آبادی 15% یا اس سے زیادہ ہے اقلیتی زبان کو بھی نظم و نسق کی زبان مان کر اہم احکامات و اعلانات اقلیتی زبان میں جاری کرتی ہیں۔ یہ اجلاس مطالبہ کرتا ہے کہ حکومت فوری طور پر مذکورہ حکم نامے کی دستبرداری کو کالعدم قرار دیتے ہوئے سابقہ حکم نامہ بحال کرے۔

☆ یہ اجلاس حکومتِ کرناٹک سے مطالبہ کرتا ہے کہ کرناٹک اردو اکادمی کے سالانہ بجٹ میں قابلِ لحاظ اضافہ کرے کیوں کہ اس اکادمی کا بجٹ نہ صرف سررشتۂ کنڑا اینڈ کلچر کی دیگر اکادمیوں سے بلکہ ملک کی دیگر ریاستی اردو اکادمیوں سے نہایت کم ہے۔ سالِ رواں کے بجٹ میں مزید 3 لاکھ روپے کی کٹوتی کی گئی ہے۔ یہ اجلاس حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ کرناٹک اردو اکادمی کا سالانہ بجٹ حکومت آندھرا پردیش کی اردو اکادمی کے مماثل کرے۔

☆ یہ اجلاس حکومتِ کرناٹک سے مطالبہ کرتا ہے کہ گورنمنٹ بی ایڈ کالج، گلبرگہ میں اردو بی ایڈ کورس کا بھی آغاز کرے جس کی منظوری 3 سال قبل حکومت سے مل چکی ہے۔

☆ یہ اجلاس مرکزی حکومت کی وزارت نشر و اشاعت سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ آل انڈیا ریڈیو بنگلور و گلبرگہ کے اردو پروگراموں کے وقت میں اضافہ کرے اور AIR میں جہاں جہاں اردو PEX کی پوسٹیں خالی ہیں وہاں اردو جاننے والے PEX کا تقرر کرے۔ دوردرشن بنگلور سے علاقائی و قومی خبریں اردو میں ٹیلی کاسٹ کرے اور گلبرگہ دوردرشن (جو کرناٹک کا پہلا دوردرشن کیندر ہے) سے آزادانہ طور پر اردو پروگراموں کے نشریے کا اہتمام کرے۔

جناب ایم اے عظیم نے اپنے صدارتی خطاب میں مجلسِ عاملہ اور ارکان عام کا شکریہ ادا کیا اور جناب خواجہ پاشا انعامدار نے جلسے کی نظامت کی۔

(ڈاک سے)

## عبدالاحد ساز کی شاعری پر مذاکرہ

● نئی دہلی، 5 رجولائی۔ ''اردو پریس کلب'' کے زیرِ اہتمام انڈیا انٹرنیشنل اینکسی میں ''ایک شام عبدالاحد ساز کے نام'' منعقد ہوئی جس کی مجلسِ صدارت میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، چیئرمین ساہتیہ اکادمی، ڈاکٹر قمر رئیس اور پیغام آفاقی شامل تھے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے کہا کہ 35 سال پہلے کا ایجنڈا خاموشی تھا اور آج کا سرگوشی۔ ندا فاضلی کی کتاب ''لفظوں کا پل'' سے عبدالاحد ساز کی غزلوں، نظموں کی دوسری کتاب ''سرگوشیاں زمانے کی'' کے سفر میں سب سے اہم بات یہ ہوئی کہ آج کا شاعر کیمونی کیٹ کرنا چاہتا ہے، سرگوشیوں میں ہی سہی۔

ڈاکٹر قمر رئیس نے کہا کہ ساز کی شاعری میں زندگی کے رموز اور موت کے اسرار دونوں کو سمجھنے کی کوشش تخلیقی سطح پر ملتی ہے۔ فرحت احساس نے کہا کہ عبدالاحد ساز نے جو شاعری کی ہے وہ اپنے عہد میں انسان کی گواہی کا درجہ حاصل کر گئی ہے۔ شمیم طارق نے ساز کی شاعری میں برجستگی، روانی اور شائستگی کو اجاگر کرتے ہوئے ان کے شعروں کی زبان کی خوبصورتی کا اعتراف کیا۔

ڈاکٹر مولا بخش اسیر، انجم عثمانی، ریوتی شرن ورما اور فیاض احمد فیضی نے عبدالاحد ساز کی شاعری پر مضامین پڑھے۔ افسانہ نگار جوگندر پال اور سہ ماہی ''استعارہ'' کے مدیر صلاح الدین پرویز نے بھی اظہارِ خیال کیا۔

عبدالاحد ساز نے اپنے تخلیقی محرکات پر روشنی ڈالی۔ تقریب کی نظامت سپریم کورٹ کے وکیل وصی احمد نعمانی نے کی اور اردو پریس کلب کے جنرل سکریٹری محمد طارق فیضی نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ دیگر اہم شرکا میں اطہر عزیز، کرنل سی. ایم. رائے، حقانی القاسمی، معصوم مرادآبادی، ذکی طارق، نگار عظیم، اندرا ورما، لولین کھنڈانی، چودھری متین احمد ایم. ایل. اے، شہپر رسول، خالد بن سہیل، ناظم نقوی، حسن کاظمی، شوکت علی فاروقی، ظہیر زیدی، حنیف کیفی، سید محی الدین للن، ظہیر برنی اور طالب رام پوری کے علاوہ اتر پردیش کے سابق گورنر رومیش بھنڈاری شامل تھے۔

(قومی آواز، نئی دہلی)

## ''ایک چھوٹا سا جہنم'' پر مذاکرہ

● ممبئی، 22 رمئی۔ ''ہر تخلیق کار اپنی دنیا کا سیاح ہوتا ہے، ساجد رشید کی دنیا ان کی کہانیوں میں ایک تجربہ گاہ نظر آتی ہے، اپنے اردگرد کے سماج اور مسائل سے جڑے کردار ان کی کہانیوں میں سانس لیتے ہیں۔'' ان خیالات کا اظہار جناب ندا فاضلی نے کردار آرٹ اکادمی اور ممبئی لٹریری اینڈ کلچر سوسائٹی کی طرف سے ممتاز افسانہ نگار جناب ساجد رشید کے افسانوی مجموعے ''ایک چھوٹا سا جہنم'' پر منعقدہ ادبی مذاکرے بحیثیت صدر جلسہ کیا۔ مہمانانِ خصوصی جناب یوسف ناظم اور ہندی کے ادیب شری جتندر بھاٹیہ تھے۔ افسانہ نگار رحمٰن عباس نے کہا کہ

ساجد رشید کی افسانہ نگاری میں بیانیہ تکنیک اور مواد کی سطح پر جہاں نمایاں تبدیلی نظر آتی ہے وہاں کینوس اور مسائل کے تحت افسانہ نگار کے وژن میں خاطر خواہ وسیع النظری ملتی ہے۔ یعقوب راہی نے ساجد رشید کے بعض افسانوں کی تکنیکی خامیوں کی طرف اشارہ کیا۔ جناب سلام بن رزّاق نے "ایک چھوٹا سا جہنم" کی کہانیوں میں موجود اشاریت، رمزیت اور علامتوں کی توضیحات پیش کیں اور کہا کہ ساجد رشید مقصدیت اور نظریے دونوں کے قائل ہیں، مگر وہ اپنے افسانوں کو کسی نظریے کی چوکھٹ پر قربان نہیں کرتے۔ جناب یوسف ناظم، مقدر حمید اور انور قمر نے بھی جلسے میں اظہار خیال کیا۔ جناب ساجد رشید نے اس موقعے پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ میں نے اس بات کو کبھی اہمیت نہیں دی کہ ناقدین نے میرے افسانوں پر توجہ نہیں کی، میرے معاصرین، میرے دوستوں نے میری کہانیوں کو بغور پڑھا، اس پر دیانتدارانہ رائے دی، میں ان کی رائے کو زیادہ معتبر و محترم سمجھتا ہوں اور ان کا ممنون بھی ہوں۔"

افسانہ نگار اسلم خاں نے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ اس ادبی نشست میں ممبئی کے مشہور اہلِ قلم محمود ایوبی، عنایت اختر، ڈاکٹر یونس اگاسکر، ڈاکٹر معین الدین جینابڑے، مشتاق مومن، م. ناگ، ڈاکٹر کلیم ضیا، مظہر سلیم، عبدالاحد ساز، جاوید ندیم، عبدالعزیز خاں، محمد حسین پرکار، الیاس شوقی، اسلم پرویز، مختار احسن انصاری، ابراہیم اشک، عثمان ملکاپوری، فاروق سید، زکریا شریف، شاہد ندیم، فرحان حنیف، آصف خاں وغیرہ بھی موجود تھے۔ اقبال نیازی نے جلسے کی نظامت کی۔ (ڈاک سے)

## پیغام آفاقی کے افسانوں پر مذاکرہ

● ممبئی اردو پریس کلب کی طرف سے ممتاز فکشن نگار جناب پیغام آفاقی کے افسانوی مجموعے "مافیا" پر ایک ادبی مذاکرے کا انعقاد انجمن اسلام کالج ممبئی وی.ٹی. میں ہوا۔ اس موقعے پر اظہار خیال کرتے ہوئے فیاض احمد فیضی نے کہا کہ پیغام آفاقی کے افسانوں کی آفاقیت یہ ہے کہ دوسروں نے جہاں اپنی باتیں ختم کی ہیں، پیغام آفاقی نے وہیں سے اپنی بات شروع کی ہے۔ جناب شمیم طارق نے "مافیا" پر گفتگو کرتے ہوئے اس بات پر افسوس ظاہر کیا کہ مافیا کے خلاف آواز بلند کرنے والے لوگ ہی مافیا کا حصہ بن جاتے ہیں۔ افسانہ نگار قمر صدیقی نے کہا کہ "مافیا" کے افسانے قابلِ مذمت روایات کے خلاف ایک احتجاج بھی ہیں اور ایک نئے تخلیقی مزاج کا پیش خیمہ بھی۔ فلمی شخصیت مجیب احمد خاں نے "پیغام آفاقی کے افسانوں میں ڈرامائیت" کے زیر عنوان اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے "مافیا" میں جرم کی گہری جڑوں سے قارئین کو واقف کرانے کی کوشش کی ہے۔ ممبر پارلیمنٹ ابو عاصم اعظمی نے کہا کہ مافیا زندگی کے ہر شعبے خصوصاً سیاست میں داخل ہو گیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ دنیا کا ہر ادیب، شاعر اور مفکر انسانی زندگی کے ہر شعبے میں مافیا کے خلاف جنگ چھیڑے تب جا کر پیغام آفاقی کی یہ کوشش کامیاب ہوگی۔ جلسے میں ڈاکٹر اسحاق جمخانہ والا صدر انجمنِ اسلام، ایڈمرل وشنو بھاگوت اور لونی میر چندانی نے بھی اظہار خیال کیا۔ جناب پیغام آفاقی نے اس موقعے پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مافیا وہ آگ ہے جس میں آج ہر انسان خود کو جلتا ہوا محسوس کر رہا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم شاعر و ادیب عوام کے دکھوں کو اپنے ساتھ شامل کر لیں تاکہ اردو والے ایک بار پھر اسی سرگرمی اور عزم و حوصلے سے ملک میں اپنا تعمیری رول ادا کر سکیں جس طرح جنگِ آزادی کے دنوں میں کیا تھا۔ آخر میں جناب امین سولکر ایڈووکیٹ نے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

(ڈاک سے)

## جشنِ شاعر

● مرمر (سعودی عرب)، 31 رمئی۔ ماہنامہ "شاعر" (ممبئی) کے 75 ویں سال میں داخل ہونے پر بزمِ احباب سخن مرمر نے اردو منزل میں ایک سمنار و مشاعرے کا اہتمام کیا تاکہ 1930 سے تا حال اس مقتدر پرچے کو جاری و ساری رکھنے والی ان تینوں نسلوں سیماب اکبرآبادی مرحوم (بانی)، اعجاز صدیقی اور ان کے فرزندان جناب افتخار امام صدیقی و ناظر نعمان صدیقی کو بھرپور خراجِ عقیدت پیش کیا جا سکے۔ یہ ادبی محفل ڈاکٹر حنیف ترین، امتیاز اعظمی، رئیس میرٹھی اور محمد فاروق کی مشترکہ کوششوں کا نتیجہ تھی۔ اس میں سعودی عرب کے مختلف شہروں کے قلم کاروں نے حصہ لیا۔ اس محفل کی صدارت انجینئر جناب عرفان الٰہی دلاور نے کی، جبکہ ڈاکٹر مصطفیٰ چودھری بحیثیت مہمان خصوصی شریک ہوئے۔ جن لوگوں نے جلسے میں اظہار خیال کیا ان میں جناب کاوش عباسی، امتیاز احمد اعظمی، نسیم سحر، ڈاکٹر مصطفیٰ چودھری، ڈاکٹر ایم. ایچ. فاروقی، جناب سید قمر حیدر قمر، جناب ڈاکٹر کاظم، جناب صدف فریدی، جناب اقبال فرید سیسوری، جناب محمود شاہد اور ڈاکٹر حنیف ترین شامل تھے۔ (ڈاک سے)

## انجمن ترقی اردو ہند (شاخ) گلبرگہ کی نئی مجلسِ عاملہ

● گلبرگہ۔ انجمن ترقی اردو ہند، گلبرگہ کی نو منتخب مجلسِ عاملہ کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ جس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

شریف احمد قریشی (صدر)، ولی احمد (نائب صدر)، امجد جاوید (نائب صدر)، خواجہ پاشا انعامدار (معتمد)، میر شاہ نواز شاہین (شریکِ معتمد)، قاسم شاہ پوری (معتمدِ تنظیمی)، ڈاکٹر رفیق رہبر (خازن)۔

مجلسِ عاملہ: ڈاکٹر عبدالحمید اکبر، جناب وہاب عندلیب، ڈاکٹر حشمت فاتحہ خوانی، ڈاکٹر حمید سہروردی، ڈاکٹر محمد ہاشم علی، ڈاکٹر جلیل تنویر، ڈاکٹر ناصر بن علی، جناب مجیب احمد۔

جناب خواجہ پاشا انعامدار (معتمدِ انجمن) نے نو منتخب عہدے داران و ارکان کا خیر مقدم کرتے ہوئے سابق عہدے داران و ارکان کی خدمات کو سراہا۔ بعد ازاں منتخب صدر انجمن جناب شریف احمد قریشی نے اپنے خطاب میں مستقبل کے منصوبوں پر روشنی ڈالی اور انجمن کے سابق صدر جناب ایم.اے. عظیم اور عہدے داران کی کارکردگی کی ستائش کی۔ جناب ولی احمد (نائب صدر انجمن) کے شکریے پر اس تقریب کا اختتام عمل میں آیا۔ (ڈاک سے)

## کرناٹک اردو اکادمی کے انعامات

● بنگلور، یکم جون۔ "اردو بولنے والے اپنی احساسِ کمتری سے نجات حاصل کرکے اردو زبان کی ترقی و ترویج کے لیے آگے بڑھیں، انگریزی و علاقائی زبان ضرور پڑھیں مگر اردو سے اجتناب نہ کریں۔" ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر ممتاز احمد خاں (بانی الامین تحریک اور پرو چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) نے 29 رمئی کو کرناٹک اردو اکادمی کے سالانہ جلسہ تقسیمِ ایوارڈ و انعامات میں بہ حیثیتِ مہمانِ خصوصی تقریر کرتے ہوئے کیا۔

اس موقعے پر ڈاکٹر فہمیدہ بیگم اور جناب ریاض احمد (جوائنٹ کمشنر آف کمرشیل ٹیکسیز) نے بھی اظہارِ خیال کیا۔

جلسے میں مہمانانِ خصوصی کے ہاتھوں حسبِ ذیل قلم کاروں کو ان کی ادبی، صحافتی اور تعلیمی خدمات کے اعتراف میں کرناٹک اردو اکادمی ایوارڈ 2004 سے نوازا گیا۔ جناب تہا تمناپوری (شاعری)، جناب محبوب (نثر نگاری)، جناب آزاد ساحری (ادب کی مجموعی خدمات)، پروفیسر م.ن. سعید (تعلیم) اور جناب خالد انجم (صحافت)۔ ان کے علاوہ جناب عبدالعلیم الامین مرحوم کی تعلیمی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ان کی اہلیہ محترمہ شاہدہ محبوب کو مومنٹو و توصیفی سند پیش کی گئی۔ نیز مطبوعہ کتب پر بھی انعامات دیے گئے جن کی تفصیل یہ ہے۔ شاعری: 'نشاطِ غم' (خلیل مامون)، 'رنگ دگر' (اقبال فرید)، 'امتیاز' (مظہر محی الدین)، 'دھوپ کی دھوم' (پرویز دھموی)۔ نثر: 'اندازِ نظر' (ڈاکٹر رفعت النساء بیگم)، 'سید مبارز الدین رفعت بہ حیثیت مترجم' (ڈاکٹر حشمت فاتحہ خوانی)، 'مجموعۂ خیال' (ڈاکٹر محمد ضیاء اللہ)، 'میری تحریریں' (ڈاکٹر محمد طیب انصاری)۔

اس موقعے پر ڈاکٹر فہمیدہ بیگم نے اکادمی کی جانب سے شائع کردہ 'کرناٹک کے اردو قلمکاروں کی ڈائرکٹری' اور ڈاکٹر طیب انصاری نے اکادمی کے ترجمانِ اذکار کے بزمِ افسانہ نمبر کی رسمِ اجرا انجام دی۔

جناب وہاب عندلیب (صدر نشین کرناٹک اردو اکادمی) نے جلسے کی صدارت کی اور جناب ملنسار اطہر احمد نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔
(ڈاک سے)

## کمپیوٹر سینٹر کے چوتھے بیچ کا افتتاح

● حیدرآباد، 26 رجون۔ کل ہند اردو تعلیمی کمیٹی کے زیرِ اہتمام چلائے جانے والے کمپیوٹرائزڈ کیلی گرافی ٹریننگ سینٹر کے چوتھے بیچ کا افتتاح بدست جناب جی سدھیر، آئی.اے.ایس. پرنسپل سکریٹری حکومت آندھرا پردیش عمل میں آیا۔ اس موقعے پر انھوں نے طالبات کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اردو زبان کے ساتھ ساتھ تکنیکی تعلیم کو جوڑنے کا مقصد یہ ہے کہ حصولِ روزگار میں آسانی ہو۔ طالبات کو چاہیے کہ وہ دلجمعی، سخت محنت، جوش و لگن سے ایک سالہ ڈپلوما کمپیوٹر ڈی.ٹی.پی. کورس مکمل کرکے خودکفیل بنیں۔ انھوں نے پی.جی. کی علاحدہ عمارت کے لیے 50 لاکھ روپے جاری کرنے کا بھی اعلان کیا۔

اس موقعے پر جناب محمد جلیل پاشا، صدر نشین کل ہند اردو تعلیمی کمیٹی و صدر کالج ڈیولپمنٹ کمیٹی نے کہا کہ اردو میڈیم کی طالبات انگلش میڈیم کی طالبات کے سامنے احساسِ کمتری کا شکار ہو جاتی ہیں جس سے نتائج متاثر ہوتے رہے ہیں اس لیے ہم نے ایک علاحدہ اردو کالج کی مانگ کی جسے حکومت آندھرا پردیش نے قبول کرلیا ہے اور اس کا نام اردو ماڈل جونیر کالج رکھا گیا ہے جو 31 رجولائی سے عمل شروع ہو جائے گا۔ اس میں تعلیم حاصل کرنے والی طالبات بہترین اساتذہ کی نگرانی میں اپنی تعلیم مکمل کرسکیں گی۔ جناب رئیس اختر نے حاضرین کا استقبال کیا اور محترمہ بی. وجیہ پرنسپل اندرا پریہ درشنی ڈگری کالج، نامپلی نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

## مختصرات

● محبوب نگر، 6 رجون۔ ممتاز استاد اور ماہرِ تعلیم جناب محمد اسحاق کے 80 ویں سال گرہ کے موقعے پر ان کی 50 سالہ تعلیمی، تدریسی اور تصنیفی خدمات کے اعتراف میں ایک جلسہ منعقد کیا گیا۔ اس جلسے میں مہمانِ خصوصی جناب سید حامد، سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور چانسلر ہمدرد یونیورسٹی، نئی دہلی تھے۔ حیدرآباد سے جناب محمود بن محمد سابق سفیر ہند برائے سعودی عرب، جناب حسن الدین احمد سابق سکریٹری سنٹرل وقف کونسل، نئی دہلی، جناب کے.ایم. عارف الدین، چیف ایڈیٹر روزنامہ "ہمارا عوام" حیدرآباد، پروفیسر احمد اللہ خاں، ڈین فیکلٹی آف لا، عثمانیہ یونیورسٹی اور جناب ملکی وی ریڈ نا، ایم.ایل.اے. نے شرکت

کی اور جناب محمد اسحاق کے کارناموں پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ (ڈاک سے)

● اجین—— مجاہد آزادی اور اردو ہندی کے قلم کار جناب امرت لال امرت کی پچاس سالہ ادبی خدمات پر بزم مولانا ابوالکلام آزاد اور بزم فنکار کی جانب سے ایک اعزازی اجلاس منعقد کیا گیا جس میں بطور مہمانِ خصوصی بزرگ ادیب وصحافی جناب محمود زکی نے موصوف کو اعتراف نامہ پیش کیا۔ اس موقعے پر محمود زکی نے بتایا کہ امرت صاحب نے قومی یکجہتی کے لیے تمام عمر کام کیا ہے اور تحریک آزادی میں حصہ لے کر جیل بھی گئے ہیں۔ انھوں نے حمد، نعت، سلام، مرثیے، نظمیں اور غزلیں ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے اور اردو ہندی دونوں حلقوں میں انھیں پسند کیا جاتا رہا ہے۔ ان کے مجموعۂ کلام 'کلامِ امرت' کی اشاعت کے پچاس سال پورے ہونے پر انھیں مبارکباد دی گئی۔

اعتراف نامہ مادھو کالج وکرم یونیورسٹی اجین کے شعبۂ اردو کے جناب ظفر محمود نے پڑھا۔ اس موقعے پر بزم فنکار کے سکریٹری اعجاز شمس نے انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا۔ جناب امرت لال امرت نے اجین کی ادبی فضا کو نئی نسل کے لیے خوشگوار بنائے رکھنے کی توقع ظاہر کی اور تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر ہیمنت نامدیو جی، جناب پربھاکر گورانہ، رحمت اللہ پاٹی دار، ڈاکٹر خان اور کریم خاں نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ نظامت کے فرائض معیار ادب کے نائب صدر زاہد خاں زاہد نے انجام دیے۔ (ڈاک سے)

● ناگپور، 30 رجون۔ اردو کے جدید شاعر سید یونس ایک سماجی خدمت گار بھی تھے اور ایک بہترین انسان بھی۔ ماہنامہ ''قرطاس'' نے ان پر ایک خصوصی نمبر شائع کر کے قیمتی مواد فراہم کر دیا ہے۔ ان خیالات کا اظہار ایڈووکیٹ حبیب الدین نے ماہنامہ ''قرطاس'' کی خصوصی اشاعت کے موقعے پر کیا۔ ادبستان کے زیرِ اہتمام جعفر نگر میں منعقدہ اس تقریب کی صدارت ڈاکٹر منشاالرحمان منشا نے کی۔ انجمن کے سکریٹری ڈاکٹر محمد اسد اللہ نے مہمانوں کا تعارف پیش کیا۔ اس موقعے پر مہمانانِ خصوصی ڈاکٹر شرف الدین ساحل، وکیل پرویز اور ''قرطاس'' کے مدیر محمد امین الدین نے اظہار خیال کیا۔

رسم اجرا کے بعد مشاعرہ ہوا جس میں ڈاکٹر منشا، فرید خاں تنویر، عاجز ہنگن گھاٹی، غلام رسول اشرف، ڈاکٹر بدر جمیل، شکیب غوثی، ڈاکٹر فداء المصطفےٰ فدوی، ڈاکٹر خواجہ ربانی، عرفان قنوجی اور مشتاق احسن نے اپنا کلام سنایا۔ جلسے اور مشاعرے کی نظامت ڈاکٹر اشفاق احمد اور کلیم احمد نے کی۔ رسم شکریہ ادبستان کے نائب صدر ڈاکٹر آغا غیاث الرحمان نے ادا کی۔ (ڈاک سے)

● سیتاپور کی ادبی تنظیم بزم اردو کی طرف سے مسلم جونیئر ہائی اسکول میں مشاعرہ منعقد ہوا جس کی صدارت مشہور شاعر صحافی جناب مست حفیظ رحمانی نے کی اور مہمانانِ خصوصی کے طور پر ڈاکٹر ثمر سنبھلی اور ڈاکٹر توصیف فتحپوری نے شرکت کی۔ نظامت کے فرائض صادق علی انصاری نے انجام دیے۔ مشاعرے سے قبل بزم کے سکریٹری رضوان خاں نے بزم اردو کی 34 سالہ خدمات پر روشنی ڈالی۔ مشاعرے میں مست حفیظ رحمانی، ڈاکٹر ثمر سنبھلی، اشتیاق علی صابا رہ بنکوی، رضوان خاں، ڈاکٹر توصیف فتحپوری، منظر یسین، سلیم اختر، عارف اٹاروی، عمران سیتاپوری اور دیگر شعرائے کرام نے اپنا کلام پیش کیا۔ (ڈاک سے)

● بنگلور۔ اکھل بھارتیہ بھاشا ساہتیہ سمیلن ہر سال آئینِ ہند کے آٹھویں جدول میں شامل زبانوں میں ادبی خدمات انجام دینے والے ادبا، شعرا اور نقادوں کو ''ساہتیہ شری ایوارڈ'' اور ''بھارت بھاشا بھوشن ایوارڈ'' عطا کرتا ہے۔ سالِ رواں میں ممتاز اردو ادیب ڈاکٹر محمد صبغۃ اللہ کو ان کی مجموعی ادبی خدمات کے اعتراف میں ''ساہتیہ شری ایوارڈ'' سے سرفراز کیا گیا ہے۔ ریاست کرناٹک کے اردو داں کو ملنے والا یہ پہلا کل ہند ایوارڈ ہے۔ (ڈاک سے)

● بلاسپور، (چھتیس گڑھ) 25 راپریل۔ ایڈس سے آگاہی ہفتے کے موقعے پر بسل ایجوکیشن سوسائٹی، بلاسپور نے صوبائی سطح پر ایک ادبی محفل کا انعقاد کیا جس میں بطور مہمانِ خصوصی رونق جمال ورگ نے شرکت کی۔ نظامت کے فرائض منصور فریدی نے انجام دیے۔ جناب رونق جمال نے ''زندگی کتنی حسین ہے'' کے عنوان سے ایڈس پر ایک افسانہ پیش کیا۔ بعد ازاں ڈاکٹر منظور راہی بلاسپوری نے ایڈس پر اظہار خیال کیا آخر میں ایک مشاعرے کا انعقاد عمل میں آیا جس میں منصور فریدی، ڈاکٹر منظور علی راہی، آر۔ جی۔ کاشی، راز ملکاپوری، شریف انصاری روف، جمیل مچھلی شہری اور کامران اعظم نے اپنے اشعار پیش کیے۔

(ڈاک سے)

## شعر و افسانے کی محفلیں

● نئی دہلی، 24 رجون۔ انڈین کلچرل سوسائٹی کے زیرِ اہتمام ہندگروپ آف کمپنیز کے تعاون سے ایوانِ غالب میں سید ظفر علی نقوی کی صدارت میں کل ہند مشاعرہ منعقد ہوا جس کی نظامت ریاض ساغر نے کی۔ اس موقعے پر مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل شری ارجن سنگھ کو استقبالیہ بھی دیا گیا۔ متین امروہوی نے استقبالیہ نظم پیش کی۔ مشاعرے سے قبل منعقدہ پروگرام میں جسٹس ای۔ڈی۔ شرما کو قومی یکجہتی اور نامور شاعر منور رانا کو میر تقی میر ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ مشاعرے میں جسٹس آر کے شکلا، آگرہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر منظور احمد، ڈاکٹر سید فاروق، ڈاکٹر کمال احمد صدیقی، ایم۔این۔ خاں، ایم۔اے۔ حق، جمیل خاں، جی ساگر سوری اور ایس۔بی۔ بھیشوری و دیگر سرکردہ شخصیات بھی موجود تھیں۔ ارجن سنگھ اور صدر تقریب سید ظفر علی نقوی و دیگر مہمانوں نے اپنے خیالات کا اظہار بھی کیا۔ اس موقعے پر وسیم بریلوی، معراج

فیض آبادی، منور رانا، میکش امروہوی، ساغر خیامی، نفیس بدایونی، اقبال آزر، انعام رمزی، دلکش آفریدی، نزہت نگار، عارفہ شبنم، پنچھ گرگ، خورشید حیدر، کوثر زیدی کیرانوی، نوشہ خان غازی نے اپنا کلام پیش کیا۔ (عالمی سہارا، نئی دہلی)

● پٹنہ، 9رمئی۔ حلقۂ ادب بہار کی طرف سے اردو بھون میں ایک مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر جناب شائل نبی، سابق وزیر حکومت بہار، بہار اقلیتی ولسانی کمیشن کے سابق چیئرمین جناب ہارون رشید، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری کے ڈائرکٹر ڈاکٹر امتیاز احمد، ڈاکٹر عبدالصمد، جناب امریک سنگھ، مسٹر ابھے کمار بیباک، جناب کمال جعفری پروگرام ایگزیکیٹو آل انڈیا ریڈیو پٹنہ، جناب رمیش کنول، ڈاکٹر اسلم جاوداں، جناب مظہر عالم مخدومی، عقیل احمد خاں، ڈاکٹر نرگس جہاں، پروفیسر اسرائیل رضا، محمد نورالہدیٰ شمسی، عبید قمر، جناب فضل رحمٰن، ڈاکٹر جاوید حیات، ڈاکٹر اشرف النبی قیصر، جناب امجد علی امجد، جناب حسن احمد، جناب شوکت علی فاروقی وغیرہ اہم شخصیات موجود تھیں۔ مشاعرے کی صدارت اردو کے ممتاز ناقد ڈاکٹر عبدالمغنی صدر حلقۂ ادب بہار نے کی جبکہ نظامت کے فرائض افسانہ نگار جناب فخرالدین عارفی نے انجام دیے۔

مشاعرے میں جن شعرائے کرام نے حصہ لیا اور اپنے کلام سے حاضرین کو محظوظ فرمایا ان کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

جناب انیس امام، ظہیر صدیقی، سلطان اختر، کمال جعفری، شکیب ایاز، ناشاد اورنگ آبادی، ناظم اجنبی، امریک سنگھ، ابھے کمار بیباک، رمیش کنول، شمیم مظفر پوری، ڈاکٹر ارمان نجمی، ڈاکٹر اعجاز علی ارشد، ظفر صدیقی، قوس صدیقی، احسن راشد، ڈاکٹر معظم عزم، شمیم پرویز، کمال نادم، ڈاکٹر پرویز انجم، شفیع الرحمٰن شفیع، منور دانا پوری، نسیم احمد نسیم اور آصف ریاض وغیرہ۔

آخر میں حلقۂ ادب بہار کے جنرل سکریٹری جناب فخرالدین عارفی نے تمام شعرائے کرام اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

● دربھنگہ، 15رجون۔ ادبی دالان کی طرف سے الحرا پبلک اسکول محلہ رحم خان کے احاطے میں منعقدہ ایک جلسے میں ڈاکٹر آفتاب اشرف کے ہاتھوں ڈاکٹر افسر کاظمی کی کتاب "مجتبیٰ بحیثیت طنز نگار" کی رونمائی کی رسم ادا کی گئی۔ اس موقعے پر طارق اقبال نے کہا کہ یہ خوشی کی بات ہے کہ انھوں نے ایک بڑے مزاح نگار مجتبیٰ حسین کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا۔ بعد ازاں مستفیض احمد عارفی نے "ایڈس" فیاض احمد وجیہہ نے "پچھواتے قدم" مجیر احمد آزاد نے "سرسوتی چیر ہرن" کے عنوان سے افسانے پیش کیے، جن پر ڈاکٹر جمال اویسی، ڈاکٹر احتشام الدین، محمد احمد آزاد، ڈاکٹر آفتاب اشرف، ارشد ترابی، ڈاکٹر افسر کاظمی، منظر سلیمان اور ہے کمار سنگھ نے اظہار خیال کیا۔ افسانوی دور کے بعد منظر سلیمان نے "میتھلی میں ناول نگاری کی ابتدا و ارتقا" کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔

پروگرام کے آخر میں مہمانِ خصوصی ڈاکٹر افسر کاظمی نے اپنا خاکہ نما انشائیہ "جی.ڈی احمر، بیگم اور فیل گڈ" پڑھا۔ جلسے کی صدارت شری وجے کمار سنگھ نے کی۔ (ڈاک سے)

● نئی دہلی، 4رجولائی۔ ای.ٹی.وی. اردو، کی جانب سے ایوانِ غالب میں "بارشِ اردو" کے عنوان سے ایک مزاحیہ مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ مشاعرے کی صدارت نامور شاعر اور مزاح نگار مجتبیٰ حسین نے اور نظامت فیاض احمد فیضی نے کی۔ اسد رضا نے طنزیہ نظم "موبائل مار"، فیاض احمد فیضی نے "ملبہ تعلیم" مجتبیٰ حسین نے "صاحب باتھ روم میں ہیں" پیش کیے۔ فلم اداکارہ تجسم کے شائستہ لطائف سن کر حاضرین قہقہے لگاتے رہے۔ فرید انجم نے حیدرآباد کی مقامی بولی میں اشعار پیش کیے۔ عادل لکھنوی، گرگٹ گورکھپوری، پاپولر میرٹھی اور سکندر حیات گڑبڑ نے بھی اپنے مزاحیہ کلام کے جوہر دکھائے۔ علاوہ ازیں دیگر شعرا میں ساغر خیامی، طالب خوندمیر، مصطفیٰ علی بیگ، محمد حمایت اللہ، مسٹر لکھنوی، سنیل کمار تنگ، شفیع شیخ، غوث خواہ مخواہ وغیرہ نے بھی اپنے مزاحیہ اشعار پیش کیے اور حاضرین کے دل جیت لیے۔ اس موقعے پر سرکردہ وزیر مملکت اکھلیش سنگھ اور جنتا دل سیکولر کے ممبر اسمبلی شعیب اقبال سمیت کئی دیگر اہم شخصیات بھی موجود تھیں۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

### رسم اجرا

## قدیم تامل ناڈو میں عربی وفارسی ادبیات کی چار سو سالہ تاریخ (جلد اوّل۔عربی)

● بنگلور، 27رجون۔ عالمی رابطہ ادبِ اسلامی شاخ کرناٹک کے زیرِ اہتمام دارالعلوم سبیل الرشاد عربک کالج، بنگلور میں ٹیپو سلطان شہید کی حیات و خدمات پر ایک روزہ مذاکرہ زیرِ صدارت مولانا سید محمد حسنی ندوی صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لابورڈ منعقد ہوا۔ اس موقعے پر ممتاز شاعر اور محقق جناب کاوش بدری کی تاریخی و تحقیقی کتاب "قدیم تامل ناڈو میں عربی وفارسی ادبیات کی چار سو سالہ تاریخ" (جلد اوّل۔عربی) کا اجرا سید محمد رابع حسنی ندوی نے کیا۔ یہ کتاب قومی اردو کونسل نے شائع کی ہے۔

سیمنار میں مندرجہ ذیل حضرات نے مقالے پیش کیے۔ مولانا مفتی محمد اشرف علی باقوی ناظم سبیل الرشاد عربک کالج بنگلور، عبدالرحیم قریشی، ڈاکٹر سید عبدالباری مدیر "پیش رفت" دہلی، انیس چشتی، ڈاکٹر سید قدرت اللہ باقوی، مولانا سید محمد واضح ندوی، ڈاکٹر محسن عثمانی ندوی، مولانا فضل الرحمٰن، مولانا ڈاکٹر ظہیر احمد باقوی راہی فدائی، مولانا محمد الیاس ندوی، مولانا ریاض الرحمٰن رشادی، منیر احمد جامی، ڈاکٹر عبدالاحد، سلیمان خان۔ کاوش بدری نے اس موقعے پر نیچ

سلطان شہید پر شعری تخلیق پیش کی۔ مذکورہ سمینار میں کاوش بدری کی کتاب کے علاوہ سرقاضی پروفیسر سید شاہ قدرت اللہ الحسینی باقوی کی کتاب فنون القرآن (صوفی، فکری، ادبی وعلمی آہنگ) اور محمد الیاس ندوی کی انگریزی کتاب A Life History of Tipu Sultan کی رسم اجرا بھی انجام دی گئی۔
(ڈاک سے)

## ابابیلیں نہیں آئیں

● سرینگر۔ جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز کے صدر دفتر لال منڈی، سرینگر میں معروف اردو شاعر ڈاکٹر حنیف ترین کے تازہ شعری مجموعے "ابابیلیں نہیں آئیں" کی رونمائی ڈاکٹر جاوید قدوس نے انجام دی۔ تقریب میں وادی کے مختلف علاقوں سے آئے ہوئے ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں نے شرکت کی۔ تقریب کے آغاز پر اکادمی کے شعبۂ اردو کے ایڈیٹر محمد اشرف ٹاک نے ڈاکٹر حنیف ترین کا سوانحی خاکہ اور اُن کے ادبی سفر کی روداد پیش کی۔ اس کے بعد اکادمی کے سکریٹری جناب رمیش مہتا نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ حنیف ترین نہ صرف ایک فنکار ہیں، بلکہ انھوں نے اردو کے کاز کو آگے بڑھانے کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا ہے۔

رفیق راز نے "ابابیلیں نہیں آئیں" پر اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر حنیف ترین مشرقِ وسطیٰ میں یہود و نصاریٰ کی بربریت کے چشم دید گواہ ہیں۔ انھیں جہاں عالمِ اسلام کی حالت زار رُلاتی ہے، وہیں انھیں معلوم ہے کہ عہدِ حاضر کے مسلمان ابابیلوں کے ذریعے غیبی امداد حاصل کرنے کی شرائط پوری نہیں کرتے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر حنیف ترین نے اپنی نظمیں بھی سنائیں۔

اس موقعے پر صدر جلسہ ڈاکٹر جاوید قدوس نے کہا کہ حنیف ترین نے عصری اردو شاعری میں بڑی تیزی سے اپنی منفرد پہچان بنائی ہے۔ "ابابیلیں نہیں آئیں" کے حوالے سے بغداد، کوفہ، غزہ اور خان یونس، صرف مقامات ہی نہیں بلکہ استعارے ہیں جو اپنے اندر عراق اور فلسطین ہی نہیں، بوسنیا اور گجرات تک کی جھلسی اور لٹی ہوئی بستیوں کی چیخیں اور مجبوریاں اور بہت کچھ سموئے ہوئے ہیں۔
(ڈاک سے)

## جانے والوں کی یاد

### جوش ادیب

● باری ٹاکلی۔ مشہور شاعر جوش ادیب کا پچھلے دنوں ایک حادثے میں انتقال ہو گیا۔ وہ 66 برس کے تھے۔ جوش ادیب کے کئی شعری مجموعے منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ مرحوم کو ان کی ادبی خدمات پر کئی علاقائی، صوبائی اور ملکی انعامات اور اعزازات سے نوازا گیا تھا۔ ہندستان بھر سے شائع ہونے والے اخبارات اور رسائل و جرائد میں ان کی تخلیقات پچھلے چالیس برسوں سے مسلسل شائع ہوتی رہی ہیں۔ ان کے انتقال پر کھنڈوہ میں ایک تعزیتی نشست ہوئی جس میں ڈاکٹر محبوب راہی، سید قدیر ایاز، قاضی حسن رضا، منشی جلیس دلکش کھنڈوی، ہارون فراق، صغیر منظر، اسد اللہ اسد اور عبداللہ شیخ نے اظہارِ تعزیت کیا۔ □□□

## بہادری کے کارنامے

**مصنف: منوج داس / مترجم: ایس ایم احمد**

ہمارے ملک کو انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کے لیے لاتعداد قربانیاں دینی پڑی ہیں۔ جن سورماؤں نے اپنی جان آزادیِ وطن کے لیے نچھاور کی، ان کی ایک طویل فہرست ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں جدوجہدِ آزادی کے ابتدائی دور کے ایسے ہی بہادر سپوتوں کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔

**صفحات: 83، قیمت: -/25 روپے**

## رام پرشاد بسمل کی آپ بیتی

**مرتب: ڈاکٹر وشوا مترا اپادھیائے / مترجم: احسان احمد صدیقی**

مادرِ وطن کی آزادی کے لیے اپنی جان کی قربانی پیش کرنے والوں میں مشہور انقلابی رام پرشاد بسمل سرِ فہرست ہیں۔ یہ آپ بیتی انھوں نے گورکھپور جیل میں اپنی پھانسی سے دو دن پہلے مکمل کی تھی۔ جدوجہدِ آزادی کے اس دور کی حقیقی تصویر کشی کے سبب یہ آپ بیتی دستاویزی اہمیت کی حامل ہے۔

**صفحات: 109، قیمت: -/33 روپے**

## سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خاں

**مصنف: راجندر اوستھی / مترجم: عبدالغفار خاں**

خان عبدالغفار خاں کی زندگی طوفانوں کی تاریخ ہے۔ ہندستان کی جنگِ آزادی سے لے کر پاکستان کے قیام کے بعد تک وہ پختونوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کے خلاف غریبوں اور مظلوموں کی لڑائی لڑتے رہے اور اس لڑائی میں ان کی زندگی کا بیشتر حصہ جیل میں گزرا۔ سرحدی گاندھی کے حالاتِ زندگی سے واقفیت کے لیے اس کتاب کا مطالعہ کریں۔

**صفحات: 78، قیمت: -/21 روپے**

## تین زِنگ نورگے

**مصنف: درگا پرشاد شکل / مترجم: جہاں آرا**

تین زنگ نورگے اور ایڈمنڈ ہلیری کوہ پیمائی کی تاریخ کے روشن باب ہیں۔ زیرِ نظر کتاب میں تین زنگ نورگے کی سوانح حیات کے ساتھ ساتھ ایورسٹ کی چوٹی سر کرنے کی مہم کی پوری تفصیل درج ہے۔ طلبہ کے لیے ایک بے حد معلوماتی کتاب۔

**صفحات: 87، قیمت: -/21 روپے**

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر۔کے۔پورم، نئی دہلی

# تبصرہ وتعارف

## خوشبو (منظر نامہ)/گلزار

**صفحات: 137، قیمت: -/69 روپے**
**ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1**
**آر.کے. پورم، نئی دہلی-66**
**مبصر: محمد اسعر فریدی**

اردو زبان وادب اور فلم کے درمیان بڑا گہرا رشتہ رہا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کبھی اس رشتے کو تسلیم کیا گیا تو کبھی اس سے صرف نظر کیا گیا لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ جہاں اردو نے ہندستانی فلموں کو زبان بخشی، وہیں ان فلموں نے اردو زبان کی شیرینی کو عام لوگوں تک پہنچایا۔ اس رشتے کو فلمی منظر ناموں اور نغموں نے مضبوطی بخشی ہے۔ منظر نامہ دراصل مناظر میں کہی گئی کہانی کو کہتے ہیں۔ انگریزی میں اسے اسکرین پلے اور سینیریو کہا جاتا ہے۔ اگرچہ عالمی ادب میں منظر نامہ ایک مکمل فارم ہے لیکن اردو میں یہ صنف ادب اپنے ابتدائی دور میں ہے۔

زیر تبصرہ کتاب ''خوشبو'' شرت چندر کے ناول ''پنڈت موشائے'' پر بنی فلم ''خوشبو'' کا منظر نامہ ہے جو ممتاز فلم ہدایت کار جناب گلزار نے تحریر کیا ہے۔ البتہ اس کہانی کی بنیاد پورا ناول نہیں بلکہ وہ حصہ ہے جس میں بیوی (کسم) کی خودداری اسے اپنے شوہر (برندابن) سے الگ بھی رکھتی ہے اور جوڑے بھی چونکہ وہ اس کا حق ہے۔ ذرا یہ منظر دیکھیے۔

''[ڈاکٹر بابو، کمرے سے نہا دھو کر تیار ہو کے باہر نکل رہے تھے، دروازے پر کسم کھڑی تھی۔ کسم کے قریب آکر ڈاکٹر رک گئے۔ اسے ایک پل چپ چاپ دیکھتے رہے اور پھر سر نیچے کر لیا اور بولے]

برندابن: کسم! جی چاہتا ہے، ایک بار پھر تمھیں ساتھ چلنے کو کہوں۔۔۔ لیکن کہتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔۔۔

[کسم چپ رہی]

برندابن: پتہ نہیں، کیا کمی ہے مجھ میں، ہر بار کسی نہ کسی وجہ سے تم نے نہ کہہ دیا۔۔۔

[کسم نے ڈاکٹر کو دیکھا]

برندابن: وہ کیا کمی ہے مجھ میں، تم بتا سکتی ہو؟

[کچھ پل چپ رہنے کے بعد کسم نے کہا]

کسم: ہاں۔۔۔ ادھیکار کی کمی ہے، آپ میں۔ جس ادھیکار سے میں روک لیتی ہوں آپ کو۔۔۔ اسی ادھیکار سے چرن کو روک لیتی ہوں میں۔ وہ ادھیکار آپ میں نہیں ہے۔۔۔ ورنہ۔۔۔ یہاں رکنے والی میں کون ہوتی ہوں۔ کیوں نہیں اسی ادھیکار سے میرا ہاتھ پکڑ کر لے گئے مجھے۔۔۔ کیوں میری ضد سنتے ہو۔۔۔ کیوں میری ہٹ مانتے ہو۔۔۔ اپنے ادھیکار سے کیوں نہیں توڑ دیتے میرے اہنکار''

یقینی طور پر منظر ناموں کی اشاعت سے جہاں وہ محفوظ ہو کر عام قاری تک پہنچ سکیں گے وہیں ٹی.وی. اور سنیما سے دلچسپی رکھنے والے شائقین یہ دیکھ سکیں گے کہ ناول، افسانہ یا کہانی کو کس طرح منظر نامے کی شکل دی جاتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ان طالب علموں کے لیے جو اسکرپٹ اور مکالمہ نگاری کے میدان میں اپنا مستقبل بنانے کے خواہشمند ہیں، یہ منظر نامے انھیں اس کی تکنیک سے باخبر کرنے میں مددگار و معاون ثابت ہوں گے۔

گلزار کے یہاں مختلف النوع قسم کے گل ہیں جن کی تجرباتی خوشبو نے اردو زبان وادب کو خوب معطر کیا ہے۔ اردو کے ساتھ ہی ہندستانی ادب میں ان کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ محبوب کی زبان کو ''اردو کی طرح'' کہہ کر گنگا جمنی تہذیب کی وارث اس زبان کو خراج عقیدت پیش کرنے والے گلزار نے اردو میں منظر نامے کی صنف کو متعارف کرکے ایک اور بڑا کام کیا ہے۔

امید ہے کہ اردو دنیا میں اس نئی صنف ادب کی ''خوشبو'' بہت دور تک پھیلے گی۔ قاری اسے پڑھتے ہوئے شرت چندر کے پھول سے بھی محظوظ ہوں گے اور گلزار کی ''خوشبو'' سے بھی۔

•

## دل کی گیتا/خواجہ دل محمد

**مرتب: مخمور سعیدی**
**صفحات: 240، قیمت: -/92 روپے**
**ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1**
**آر.کے. پورم، نئی دہلی-66**
**مبصر: رئیس احمد**

''دل کی گیتا'' (شریمد بھگوت گیتا کا منظوم اردو ترجمہ) کا زیر نظر ایڈیشن قومی اردو کونسل نے شائع کیا ہے جسے جناب مخمور سعیدی نے مرتب و مدوّن کیا ہے۔

اس کا پہلا ایڈیشن خواجہ دل محمد کی حیات ہی میں لاہور سے شائع ہوا تھا، بعد ازاں اس کے مختلف ایڈیشن منظر عام پر آئے اور خواجہ دل محمد کی وفات کے کئی سال بعد اس کتاب کا آخری ایڈیشن بزمِ ادب فرید آباد (ہریانہ) سے شائع ہوا، جس کی بنیاد نسخۂ اوّل کے متن پر مبنی تھی۔

نسخۂ ہذا کی ترتیب و تدوین میں مخمور سعیدی صاحب نے انہی دونوں (اوّل و آخر) نسخوں کو پیش نظر رکھا ہے، ساتھ ہی اپنے مقدمے میں ان نسخوں کا اجمالاً تعارف بھی کرایا ہے جو اب قریب قریب نایاب ہیں، علاوہ ازیں خواجہ دل محمد کا مختصر تعارف اور ان کے علمی، ادبی اور شاعرانہ مرتبے پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس عمل سے زیر تبصرہ ایڈیشن کی تاریخی، تنقیدی اور ادبی اہمیت میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔

''شریمد بھگوت گیتا'' ایک مذہبی صحیفۂ افکار ہے۔ اس میں جن مذہبی اور اخلاقی تعلیمات و نظریات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ ان کی اہمیت و افادیت کا اندازہ اس بات سے ہی لگایا جا سکتا ہے کہ ہزار ہا سال گزر جانے کے بعد بھی اس کے ماننے والے ہنوز ان افکار و خیالات کو اپنی زندگی کا ایک اہم جز تصور کیے ہوئے ہیں، اور ''شریمد بھگوت گیتا'' کی یہ تعلیمات ''فکر و عمل' پر مبنی زندگی کا ایک اہم فلسفہ پیش کرتی ہیں جو وقت بر وقت بنی نوع انسان کے لیے تاریک اور سنسان راہوں میں چراغ راہ سے کم نہیں۔ یہ منظوم صحیفۂ افکار 18 ابواب (ادھیائے) پر مشتمل ہے۔ ان جملہ ابواب میں فلسفۂ 'فکر و عمل'، 'عرفانِ حق' اور 'عشق خداوندی' کو (بالترتیب) بطور خاص موضوع بنایا گیا ہے۔ 'شریمد بھگوت گیتا' کی ان تعلیمات کی رُو سے 'موکش' کی منزل تک پہنچنے کے لیے انسانی کردار میں متذکرہ صفات کا ہونا لازم ہے۔

اس صحیفے کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہ بھگوان شری کرشن کی زبانی ادا ہوئی تھی اور اس کے شروع میں 'شریمد' کا جو اضافہ ہے وہ تعظیم کا کلمہ ہے۔ ایک مذہبی عقیدے کے مطابق شری کرشن نے یہ تعلیم بکرمی سمت کے منگر شدی گیارس کے دن دی تھی اور اسی نسبت سے ہر سال کوروکشیتر (بھگوت گیتا کی جنم بھومی) میں گیتا جینتی بڑی عقیدت و احترام سے منائی جاتی ہے۔

'شریمد بھگوت گیتا' کا بنیادی پیغام نیک عمل کی تلقین اور ظلم و ستم کے خلاف آواز اٹھانا ہے۔ جب ارجن نے اپنے اعزا و اقارب کو اپنے مخالفین کی صفوں میں پایا تو وہ بہت بددل ہوا اور دھنش چھوڑ کر بیٹھ گیا، تو شری کرشن نے اسے اپنے فرض کا احساس دلایا اور بہ نفس نفیس جنگ میں شامل ہونے کو جائز قرار دیا، جبکہ اس محاذ آرائی اور میدانِ کار زار میں قریبی رشتے داروں کے علاوہ اس کے گرو درونا چاریہ بھی شریک تھے۔ شری کرشن نے ارجن کو نہ صرف یہ احساس دلایا بلکہ قائل کیا کہ حق و صداقت اور کفر و باطل کی رزم گاہ میں ذاتی تعلقات کی کوئی اہمیت نہیں۔ آخر میں شری کرشن نے ''شریمد بھگوت گیتا'' کی جملہ تعلیمات کو ـــ 'راج وِدیا' سے تعبیر کرتے ہوئے کہا ہے کہ ـــ '' گیتا میرے دل کی آواز ہے، جو بھی اس پر لبیک کہے گا اور دوسروں کو بھی اس جانب متوجہ کرے گا، وہ یقیناً 'نروان' کا مستحق ہوگا۔''

اگرچہ دنیا کی دیگر زبانوں میں بھی شریمد بھگوت گیتا کے تراجم ہوتے رہے ہیں، لیکن اردو زبان میں اس کی روایت بڑی مستحکم ہے اور خواجہ دل محمد صاحب کا یہ ترجمہ (دل کی گیتا) بہترین منظوم تراجم میں سے ایک ہے۔

زبان و بیان کے اعتبار سے یہ منظوم متن ''ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد'' کا مصداق ہے۔ ساتھ ہی تفحص الفاظ اور فصاحتِ بیان کی عمدہ مثال بھی۔ ترجمے میں بہت سے مقامات پر کثیر المعانی اور مشکل الفاظ بھی در آئے ہیں جن کی بنا پر قارئین کی رسائی معانی مطلوب تک مشکل ہو سکتی تھی، لیکن خواجہ دل محمد صاحب نے ایسے جملہ مقامات پر حاشیہ جات میں لغوی و اصطلاحی معانی کے علاوہ مع تشریح و توضیح وہ معانی و مطالب بھی درج کر دیے ہیں جو موقع و محل کی مناسبت سے وہاں مراد لیے گئے ہیں۔ اس طرح ''شریمد بھگوت گیتا'' کے اس منظوم اردو ترجمے کو مکمل ترجمانی کی حیثیت حاصل ہے، اور یہی اس ترجمے کا نمایاں وصف بھی ہے۔

''دل کی گیتا'' کی اشاعت نو پر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان قابلِ صد مبارکباد ہے۔

●

## میزان الطب/حکیم محمد اکبر

**صفحات: 276، قیمت: -/63 روپے**

**ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1**
**آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-66**

**مبصر: فیضان احمد جیراجپوری**

''میزان الطب'' طب یونانی سے متعلق ہے۔ اس کے مصنف حکیم محمد اکبر نے طب اکبر، مفرح القلوب، قرابادین قادری، حدود الامراض جیسی گرانقدر کتابیں لکھی ہیں۔

حکمت کے طالب علموں کے لیے اس کتاب کا پڑھنا نہایت ضروری ہے اور یہ اس قابل ہے کہ اس کو نصاب میں شامل کیا جائے تا کہ ہر طالب علم اس سے فیضیاب ہو سکے۔ اس میں ان تمام ضروری مسائل سے بحث کی گئی ہے جن سے طب کے طلبہ کو سابقہ پڑتا ہے۔

یہ کتاب تین ابواب میں منقسم ہے پہلے میں چاروں مزاجی کیفیات یعنی حرارت، برودت، رطوبت اور یبوست کی علامات اور نشانیاں بتائی گئی ہیں۔ دوسرے باب میں چاروں خلط یعنی خون، بلغم، سودا، صفرا کا ذکر ہے جن سے بدن بنا ہے اور اکثر بیماریاں انہی کی زیادتی یا کمی سے پیدا ہوتی ہیں۔ علاج کے ضمن میں مفرد، مرکب دواؤں کے ساتھ ساتھ مناسب غذاؤں کا بھی ذکر کیا گیا ہے اور خلط

کے واسطے معتدل اور یہ جدا جدا بیان کی ہیں تا کہ طلبہ آسانی سے سمجھ سکیں۔ اخلاط کو اعتدال پر لانے کے لیے دو طریقے رائج ہیں: ایک طریقہ تو یہ کہ دوا معدے میں پہنچائی جائے۔ دوسرا طریقہ دُوا معدے میں پہنچائے بغیر اخلاط کی تعدیل و اصلاح کا ہے جس کی کئی صورتیں ہیں جیسے شموم، تحلیہ، نفوخ، قطور، نطول، انکباب، حمول، طلا وغیرہ۔ مصنف نے ان تمام طریقوں کی وضاحت بھی کردی ہے تا کہ طلبہ پورے طور سے استفادہ کر سکیں۔

تعدیل اور اصلاح کا ایک اور طریقہ بھی ہے جس کو فصد کہتے ہیں۔ یہ طریقہ بہت قدیم ہے۔ بعض اطبا اسے متروک بھی قرار دے چکے ہیں لیکن حکیم محمد اکبر صاحب نے اس پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ اس کے علاوہ منضجات مسہلات، ملینات مدرات، مقیات، مقویات کے افعال و مواقع کا ذکر کر کے اس باب کو ختم کیا گیا ہے۔

آخری باب ''امراض اوران کا علاج'' ہے جس میں سر سے لے کر پاؤں تک کے امراض سے بحث کی گئی ہے۔ یہ کتاب اطبا اور طب کے طلبہ کے علاوہ عام لوگوں کے لیے بھی افادیت اور اہمیت کی حامل ہے۔

•

## افق/ویریندر پٹواری

**صفحات:160، قیمت:-/150روپے**

**ناشر: ویریندر پٹواری، 102، ڈی لکس اپارٹمنٹس، وسندھرا انکلیو، دہلی-96**

**مبصر: عبدالرب**

''افق'' ویریندر پٹواری کی کہانیوں کا چھٹا مجموعہ ہے۔ ویریندر پٹواری ان افسانہ نگاروں میں سے ہیں جنھوں نے جدیدیت کے زیر اثر لکھنا شروع کیا اور ان کا تشخص بہر حال جدیدیت سے وابستہ ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ سکہ بند جدیدیت سے ایک حد تک آزاد رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ عام طور پر اسطوری افسانہ لکھتے ہیں۔ لیکن یہ افسانے اپنے تہذیبی سروکار سے یکسر بے تعلق نہیں ہوتے خصوصاً کشمیر سے ان کی والہانہ وابستگی ان کے افسانوں کی ارضی بنیادوں کو مضبوط کرتی ہے۔ ان کے سلسلے میں محمود ہاشمی نے لکھا بھی ہے کہ ''ویریندر پٹواری نے اپنے اسطور کے تناظر میں اپنی دنیا کو دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا ہر افسانہ زندگی اور انسانیت کے اقداری تصور سے جڑا ہوا ہے وہ اپنے زمانے کی وحشت اور دہشت سے پشیمان اور پریشان ہے۔''

بہر حال اس میں کلام نہیں کہ ویریندر پٹواری نے اپنے اسطور کے تناظر میں اپنی دنیا کو دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں ان کی کہانیاں ''سراب'' اور ''افق'' خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔ ان کی کہانیوں میں استعاراتی انداز عام طور پر پایا جاتا ہے اور ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ بعض اَن کہی حقیقتوں سے بھی کام لینا جانتے ہیں۔ یہ آرٹ ہمارے افسانہ نگاروں میں بہت کم پایا جاتا ہے۔

ان کے بعض افسانے سرتاپا استعاراتی قسم کے ہیں مثلاً ''چیل''، ''بکرا'' وغیرہ۔ ''خلش'' میں ایک خاص قسم کی نفسیاتی کیفیت کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس کی لطافت کو ان کے اسلوب نے پوری طرح برقرار رکھا ہے۔ ان کا پہلا افسانہ ''افق'' کشمیر سے ان کی والہانہ وابستگی کا ثبوت پیش کرتا ہے۔ اس افسانے میں انھوں نے ''افق'' کو جس شکل میں پیش کیا ہے وہ ان کی قوتِ مشاہدہ کی دلیل ہے۔ اس میں افق سے وابستہ تصورات اور ارضیت کی رعایت سے جس طرح افسانہ مکمل کیا گیا ہے اس کی مثالیں بہت کم دیکھنے کو ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ اس مجموعے میں ''سودا'' جیسی کہانی بھی شامل ہے جس میں داستانوی رنگ صاف جھلکتا ہے۔ ان افسانوں میں اس قسم کا کہانی پن تو نہیں پایا جاتا جو روایتی کہانیوں کا طرۂ امتیاز ہے لیکن یہ انشائیے بھی نہیں ہیں۔ ان میں ایک اندرونی ربط بہر حال پایا جاتا ہے۔ ''عذاب''، ''کرب''، ''جمود'' اور ''ایک ہی خواہش'' وغیرہ افسانے عصرِ حاضر کے ان مسائل کا احاطہ کرتے ہیں جو عصرِ حاضر کے ہر انسان کا مقدر بن چکے ہیں۔ ان کہانیوں میں اپنے عہد سے ناآسودگی کا جذبہ شدت سے پایا جاتا ہے جب کہ ''خلش'' اور ''ہم دونوں'' وغیرہ کہانیاں عشقیہ موضوعات پر لکھی گئی ہیں جن میں مصنف کی رواں دواں نثر نے جان ڈال دی ہے۔

ویریندر پٹواری کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ وہ زبان پر قدرت رکھتے ہیں اور اس کی تمام جہتوں سے کام لے سکتے ہیں۔ اسی لیے وہ اپنے فن میں کامیاب ہیں۔ اگرچہ انھوں نے ڈرامے اور ناولٹ بھی لکھے ہیں اور اس مجموعے کا آغاز ایک نظم سے ہوتا ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں شاعری سے بھی شغف ہے۔ لیکن مرکزیت افسانہ نگاری کو حاصل ہے اور ان کی تخلیقات ہند و پاک کے موقر جریدوں میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ اس مجموعے میں کل بیس کہانیاں شامل ہیں اور ان میں ہر ایک قابلِ مطالعہ ہے۔ امید ہے کہ یہ مجموعہ ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

•

## اشاریہ دلگداز/محمد قمر سلیم

**صفحات:239، قیمت:-/175روپے**

**تقسیم کار: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ممبئی، علی گڑھ**

**مبصر: خورشید زمانی ردولوی**

ادبی تحقیق میں اشاریہ سازی کی اہمیت مسلم ہے اور اردو کی تحقیقی تصانیف میں اس کی روایت عام ہوگئی ہے۔ ادبی تحقیق کا کام کرنے والوں

کے لیے کتابوں کے علاوہ رسائل وجرائد میں اہم ماخذ کا کام انجام دیتے ہیں مگر رسائل کی تمام جلدوں کو کھنگال کر اپنے مفید مطلب ماخذوں کی تلاش جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ ماضی میں اردو میں معیاری رسائل کی معتد بہ تعداد تھی جن میں اعلا درجے کے علمی، تحقیقی و ادبی مضامین شائع ہوئے تھے اب اس بات کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ ان اہم رسائل کے اشاریے اگر تیار ہوجائیں تو ادبی تحقیق کا کام مزید آسان ہوجائے۔ اس ضمن میں قابلِ لحاظ پیش رفت ہوئی ہے اور اردو کے بعض اہم رسائل جیسے ''معارف'' اعظم گڑھ، ''نگار'' لکھنؤ، ''نوائے ادب'' ممبئی، ''آجکل'' نئی دہلی، ''نیا دور'' لکھنؤ، ''برہان''، دہلی، ''اردو ادب'' دہلی، ''ہماری زبان'' دہلی وغیرہ کے اشاریے تیار کیے گئے ہیں اور کچھ شائع بھی ہوچکے ہیں۔

اردو زبان وادب کی تاریخ میں مولانا عبدالحلیم شرر کے رسالے ''دلگداز'' کی اہمیت مسلّم رہی ہے، ضرورت تھی کہ اس کا اشاریہ بھی تیار کیا جائے۔ اس مشکل کام کا بیڑا قمر سلیم صاحب نے اٹھایا اور جانفشانی اور تندہی کے ساتھ اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ کتاب کی ابتدا میں ڈاکٹر یونس اگاسکر کا پیش لفظ ہے جس میں انھوں نے اشاریہ سازی کی اہمیت اور کتاب کے مشمولات پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ حرفِ آغاز میں قمر سلیم نے عبدالحلیم شرر کی ہمہ جہت شخصیت اور رسالہ ''دلگداز'' کی جامعیت پر روشنی ڈالی ہے اور 1887 سے 1918 تک اس کا اشاریہ پیش کیا ہے۔ پھر ایک مبسوط اور عالمانہ مقدمہ تین حصوں میں پیش کیا ہے۔ مقدمہ ''الف'' میں اشاریہ کیا ہے؟ اشاریے کی تعریف، ہندستان میں اردو میں اشاریہ سازی، ادبی رسائل کے اشاریے کی اہمیت، حصہ ''ب'' میں عبدالحلیم شرر، سوانح اور شخصیت، حالاتِ زندگی، شخصیت و تصانیف اور حصہ ''ج'' میں ''دلگداز'' تاریخی اور تنقیدی جائزہ۔ دلگداز اجرا سے اختتام تک، دلگداز کے اغراض ومقاصد، اس کی انفرادیت، اس کے قلم کار اور ادبی رسائل میں دلگداز کا مقام پر کتاب میں تفصیلی اور سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

قمر سلیم صاحب کا مرتبہ اشاریہ 1887 سے 1918 تک کے شماروں پر محیط ہے اس بتیس سالہ مدت میں ''دلگداز'' نے علمی، ادبی، ثقافتی اور تاریخی مشمولات کے علاوہ تراجم بھی شائع کیے، عورتوں کے مسائل پر مضامین چھاپے اور عصری میلانات کا احاطہ کیا، غرض کہ یہ پرچہ ہنداسلامی تاریخی وتہذیبی شعور کا اشاریہ بن گیا۔ ایسے پرچے کا اشاریہ، بذاتِ خود غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے اور اس کام کی نوعیت کو منفرد بناتا ہے۔

قمر سلیم نے ''دلگداز'' کی اشاریہ سازی کرکے ادب کی اہم خدمت انجام دی ہے، تحقیق کے لیے جس ضبط واحتیاط کی ضرورت ہے اس کی جلوہ گری ہر صفحہ سے عیاں ہے۔ وہ پروفیسر محمد حنیف کیفی کے خلف اکبر ہیں امید ہے کہ اس کی دوسری جلد بھی جلد شائع ہوگی اور پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔

□□□


**گاندھی کی کہانی**

**مصنف: راجکماری شنکر/مترجم: نامی انصاری**

اس کتاب میں بابائے قوم کی سوانح حیات کے ساتھ ساتھ
ہندستان کی تحریک آزادی کی تاریخ بھی عام فہم زبان میں درج کی گئی ہے۔
گاندھی جی اور ان سے متعلق دیگر افراد کی تصویریں بھی کتاب میں موجود ہیں۔

صفحات: 120، قیمت: -/35 روپے

**بچوں کے نہرو**

**ایم. چالاپاتھی راؤ/مترجم: نامی انصاری**

پنڈت جواہر لال نہرو بچوں کو بے حد عزیز رکھتے تھے اور اس لیے بچے انھیں
چاچا نہرو کہتے تھے۔ اس کتاب میں جدید ہندستان کے اس معمار کی حیات
اور شخصیت کے تمام گوشوں پر نظر ڈالی گئی ہے۔

صفحات: 112، قیمت: -/32 روپے

**اندرا پریہ درشنی**

**مصنفہ: اُما شنکر/مترجم: بشیق مظفر پوری**

اس کتاب میں تقریباً تین دہائیوں تک ہندستانی سیاست پر
چھائی رہنے والی اندرا گاندھی کی شخصیت اور زندگی
کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

صفحات: 142، قیمت: 45 روپے

**شنکر**

**مصنفہ: اُما شنکر/مترجم: انیس اعظمی**

ملک کے مایۂ ناز کارٹونسٹ کیشو شنکر پلئی کی سوانح،
جو دلچسپ بھی ہے اور حوصلہ بخشنے والی بھی۔

صفحات: 128، قیمت: -/35 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

**قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان**

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

تحریر: مالا جنار دھن
ترجمہ: شمیمہ بیگم

بچوں کا گوشہ

زندگی کو سمجھنے اور اسے بہتر بنانے میں اچھا ادب معاون ہوتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اپنے پڑھنے والوں کو یہ ذہنی تفریح بھی بہم پہنچاتا ہے۔ بڑوں کی طرح بچوں کا بھی یہ حق ہے کہ ان کی ذہنی ضرورتوں کے مطابق انہیں اچھا ادب فراہم کیا جائے جو سبق آموز ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ بھی ہو تاکہ بچے خوشی خوشی اس کا مطالعہ کریں۔ کونسل نے چلڈرن بک ٹرسٹ کے اشتراک سے بچوں کے لیے بڑی تعداد میں ایسی کتابیں شائع کی ہیں جو اس معیار پر پوری اترتی ہیں۔ ذیل میں قومی اردو کونسل کی شائع کردہ کتاب "دوربین" سے ایک کہانی پیش کی جارہی ہے۔

کہانیوں سے انسان کا روزِ ازل سے گہرا رشتہ رہا ہے۔ خصوصاً بچوں کے لیے ان کی اہمیت یوں بھی بہت زیادہ ہے کہ اس سے ان کی تفریح کے ساتھ ساتھ اخلاقی تربیت بھی ہوتی ہے۔ "دوربین" کی کہانیاں اسی نوعیت کی ہیں۔ اس کتاب کی چند اہم کہانیاں ہیں: "کفن چور، ہم تنہا ہیں، خاندانی بندھن، دادی ماں کی واپسی، ٹھٹھیری کا گھونسلہ، کفّارہ، ننھا باورچی، پیڑ بھی دوست بناتے ہیں، بولتا توتا وغیرہ۔

247صفحات کی اس کتاب کی قیمت صرف -/85 روپیے ہے۔ کونسل اپنی کتابوں پر طلبہ اور اساتذہ کو 40% خصوصی رعایت بھی دیتی ہے۔

# ہمیشہ دیر سے آنے والی لڑکی

''اِسمتا جلدی اٹھو ورنہ اسکول کے لیے دیر ہو جائے گی۔'' مسز گپتا نے اپنی سوئی ہوئی بیٹی کو ہلا کر کہا۔

''ساڑھے سات بج چکے ہیں اور آدھے گھنٹے بعد تمھاری بس آجائے گی۔ اُٹھ کر تیار ہو جاؤ۔'' اِسمتا نے بستر پر بیٹھ کر انگڑائی لی۔

وہ ایک اچھی کھلاڑی تھی اور تھانہ کے ایک ممتاز اسکول میں پہلے سال کی طالبہ تھی۔ یہ اسکول ممبئی کے باہری علاقے میں تھا۔ اِسمتا پڑھائی میں بہت ہوشیار تھی اور کلاس میں ہمیشہ اوّل آتی تھی حالاں کہ اس بات سے اس کے والدین اور ٹیچر کو خوش ہونا چاہیے تھا لیکن اُس میں دیر کرنے کی ایک بُری عادت تھی۔ وہ اسکول بھی اکثر دیر سے پہنچتی تھی۔ کھانے کا وقفہ ہو یا کھیل کا میدان، مجال ہے کبھی وقت پر پہنچ جائے۔ حد ہے کہ جب چھٹی کا آخری گھنٹہ بجتا تو گھر جانے میں بھی وہ دیر کر دیتی تھی۔ یہاں تک کہ اپنی بہترین دوست ڈوّیا باسو سے اسی سستی کی وجہ سے اس کے تعلقات خراب ہو گئے تھے۔

ہر روز کا یہی تماشا تھا اِسمتا جلدی جلدی نہائی، ناشتہ کیا اور سامنے کے دروازے کی طرف بھاگی کہ اس کے والد نے بتایا اس کی اسکول بس تو پانچ منٹ قبل نکل چکی ہے۔ میں تمھیں کار سے اسکول چھوڑ دوں گا۔ مگر ''اِسمتا یہ کوئی پہلی دفعہ نہیں ہوا ہے۔'' اس کی ممی نے کہا ''یاد ہے گزشتہ ماہ تم نے اپنے اسکول کی پکنک بھی اسی وجہ سے چھوڑ دی تھی۔'' انھوں نے اِسمتا کو یاد دلاتے ہوئے کہا ''سچ مچ تمھیں ہر کام جلدی کرنا چاہیے۔'' جیسے ہی مسٹر گپتا اپنی کار اسکول کی طرف لے چلے، اِسمتا کو وہی واقعہ یاد آیا جو اس کی ممی نے غصے میں سنایا تھا۔ اس کی کلاس ٹیچر نے ایک تفریحی پروگرام ''ٹڈ آئی لینڈ'' جانے کا بنایا۔ ہر لڑکی کو کھانے کا کچھ سامان اپنے ساتھ لانا تھا۔ اِسمتا نے فیصلہ کیا کہ وہ پکنک کے دن کچھ پنیر کے سینڈوچ اور سنترے کا شربت لائے گی۔ وہ صبح

سویرے اٹھی اور بہت خوش تھی کہ آج وہ وقت پر تیار ہوگئی۔ جیسے ہی گھر سے نکل رہی تھی، اس کی ممی نے آواز لگائی" کیا تم نے اپنے سینڈوچ اور سنترے کا شربت رکھ لیا؟" اسمتا راستے میں ہی رُک گئی اور رونی سی آواز میں بولی" اوہ میں تو سینڈوچ بنانے ہی بھول گئی اور اب بنانے کا وقت بھی نہیں ہے۔"

اس کی ممی نے کہا" میں کاٹنے اور بنانے میں تمھاری مدد کروں گی۔" ان دونوں نے جلدی جلدی ڈبل روٹی پر پنیر پھیلایا اور انھیں تکونا کاٹا اور انھیں ایک بڑی پلاسٹک کی تھیلی میں رکھا۔ اسمتا نے اپنے بھائی سے سائیکل مانگ لی اور اسکول کی طرف تیزی سے گئی مگر وہاں کلاس خالی تھی۔ اس کے پیچھے سے ایک آواز آئی" اسمتا گپتا تم پکنک کے لیے اتنی دیر سے کیوں آئی ہو؟" اور جب اس نے مڑ کر دیکھا تو اس کے فزکس کے ٹیچر غصے سے دیکھ رہے تھے۔" تمھاری کلاس نے پندرہ منٹ انتظار کیا اور وہ ڈزنی لینڈ کے لیے روانہ ہو گئے۔ لڑکی کیا تم کبھی جلدی نہیں کر سکتیں؟"

"خیر" میں نے اس پکنک کو چھوڑنے کی زیادہ پرواہ نہیں کی۔ وہ کار میں یہی سوچتی رہی۔

جیسے ہی اپنی کلاس میں داخل ہوئی، ایک لڑکی نے طنزیہ کہا" لو آخر آہی گئیں مس۔۔۔۔ جو کبھی وقت پر نہیں آتیں۔"

دوسرے کونے سے ایک لڑکی بولی" آج تم اکیلی ہی پکنک پر چلی گئی تھیں؟"

کلاس مانیٹر الکا سنہا نے سخت آواز میں کہا" اسمتا میں سنجیدگی سے کہہ رہی ہوں، اگر تم وقت پر نہ آئیں تو مجھے ٹیچر سے تمھاری شکایت کرنی پڑے گی۔ مجھے امید ہے آئندہ تم وقت پر آنے کی کوشش کروگی۔" اسمتا نے ہلکے سے سر ہلایا اور دوسری لڑکیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی دوست وِدّیا کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔

وِدّیا نے کہا" سچ سچ اسمتا تم کبھی جلدی آنے کی کوشش بھی نہیں کرتی ہو۔ لوگوں کے کہنے کا بھی تم پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ ایک دن تم اپنی اس بُری عادت کی وجہ سے کسی مصیبت میں پھنس جاؤ گی۔"

اسمتا جھنجھلا کر اپنی بہترین دوست پر بھی بڑبڑائی۔" اب تم نہ شروع ہو جانا"۔ تھوڑی دیر ہو جانا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ اپنی پڑھائی میں اتنا کھو گئی کہ اپنا خراب موڈ بھی بھول گئی۔

سالانہ امتحان نزدیک آ رہے تھے، اسمتا اس مرتبہ بھی رات رات بھر جاگ کر پڑھائی کر رہی تھی کہ ہمیشہ کی طرح اوّل آئے۔ مگر سالانہ امتحان کے پہلے دن ہی اپنی عادت کے مطابق اسے گھر سے نکلنے میں دیر ہوگئی۔ جیسے ہی وہ گلی کے نکڑ پر پہنچی اس نے دیکھا کہ اس کی بس نکل چکی تھی۔

"اوہ نہیں۔ اب میں امتحان کے لیے اسکول کیسے پہنچوں گی؟ وہ بہت مایوس ہوگئی۔ آج اس کے والد بھی شہر کے باہر گئے ہوئے ہیں۔"

ابھی وہ مشکل سے ایک فرلانگ ہی گئی ہوگی کہ اس کے قریب آ کر ایک کار کی رفتار ہلکی ہوئی جس میں ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا اس نے کھڑکی سے اپنا سر نکالا اور کہا" کیا تمھیں اسکول کے لیے دیر ہو رہی ہے۔ میں تمھیں پہنچا سکتا ہوں؟"

اسمتا ایک منٹ کو تو ہچکچائی مگر پھر اسے امتحان چھوٹ جانے کی فکر تھی۔ اپنے شک وشبہ کو بھول کر کہ کسی اجنبی سے مدد نہیں لینی چاہیے، وہ اپنے اسکول کا نام بتا کر سیٹ پر بیٹھ گئی۔ دھیرے دھیرے گاڑی کی رفتار بڑھتی گئی۔ دکانیں اور عمارتیں غائب ہوگئیں اور ان کی جگہ ہرے ہرے کھیت

اور سنسان سڑکیں نظر آنے لگیں۔ اسمتا تیزی سے بولی۔ ''یہ تو میرے اسکول کا راستہ نہیں ہے، تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟'' سامنے کی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے وہ بزرگ آدمی ہنسا اور بولا'' میں تمھیں بہت دن سے دیکھ رہا ہوں کہ گھر سے اسکول جاتے ہوئے دیر سے نکلتی ہو۔ میرے دل میں خیال آیا کہ تمھیں اغوا کیا جائے اور اپنے کھنڈالہ والے پرانے مکان میں لے جا کر رکھوں، مجھے یقین ہے تمھاری رہائی اور صحیح سلامت واپسی کے لیے تمھارے والدین مجھے لاکھوں روپے معاوضہ ادا کریں گے، اب سیدھی بیٹھو ورنہ مجھے تمھیں باندھنا پڑے گا۔''

''اغوا'' اسمتا صدمے سے چُپ کی چُپ رہ گئی۔ گاڑی ممبئی کو بہت پیچھے چھوڑ آئی تھی، یہاں نہ زیادہ سواریاں نظر آ رہی تھیں، نہ ہی آدمی۔ وہ خود کو بچانے کے لیے کیا کر سکتی تھی؟

اس کی انگلیاں گھبراہٹ میں اسکول بیگ میں گئیں تو کسی چکنی چکنی چیز سے ٹکرائیں۔ پلاسٹک، وہ ایک بڑا پلاسٹک کا بیگ تھا جس میں پکنک کے دن اس نے سینڈ وچ رکھے تھے۔ کتابوں کے ساتھ وہ بستے میں ہی رہ گیا تھا۔ جیسے ہی اسمتا نے اسے نکالا اس کا دماغ کام کرنے لگا۔ اُسے ایک امید بندھی، اس نے اس میں ہوا بھری ہاتھ میں پکڑا اور ایک ہی جھٹکے میں آگے کی سیٹ کے پیچھے دے مارا۔

''پھٹ'' اس دھماکے نے آگے والے آدمی کو آواز نکالنے پر مجبور کیا۔ اس نے غصّے میں کہا'' کیا غلط وقت پر ٹائر پھٹا ہے''۔ غصّے میں چیک کرنے کے لیے گاڑی سے نیچے اُترا۔ اسمتا کے لیے یہ لمحہ کافی تھا وہ دوسری طرف سے نیچے اتری اور تیزی سے اس طرف دوڑنا شروع کر دیا جہاں سے آئے تھے۔ اغوا کرنے والا'' رکو، رکو'' کہتا ہوا بھاگا مگر وہ اسمتا کا مقابلہ نہ کر سکا، وہ بہت تیز دوڑ رہی تھی کیوں کہ اسے اپنی جان بچانی تھی۔ اپنے اسکول بیگ سمیت بھی اسمتا اتنا تیز دوڑ رہی تھی کہ اس نے ممبئی کی طرف تقریباً ایک میل کا راستہ طے کر لیا۔ ابھی وہ ممبئی سے کافی دور تھی اور آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ تبھی اس نے ایک جانی پہچانی آواز سنی، کوئی آواز دے رہا تھا۔

'' کیا یہ اسمتا گپتا ہے'' تم اس سڑک پر اکیلی کیا کر رہی ہو؟ اپنے اسکول اور گھر سے اتنی دور؟'' اسمتا نے جیسے ہی مڑ کر دیکھا اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ کوئی اور نہیں اس کے ڈیڈی کے دوست اور ساتھی مسٹر کیشو ن تھے جو موٹر سائیکل پر بیٹھے اسے دیکھ رہے تھے اس نے جلدی جلدی اپنی پوری داستان انھیں سنائی۔ انھوں نے حیرت سے سنا۔

'' تم خوش قسمت ہو'' میں دفتر کے کسی کام سے کلیان آیا تھا کہ تمھیں یہاں پایا۔ تم نے یہ ہوشیاری کی کہ اغوا کرنے والے کی گاڑی کے نمبر نوٹ کر لیے۔ مجھے کوئی شک نہیں کہ وہ بہت جلد پکڑا جائے گا۔ اب تم موٹر سائیکل پر آجاؤ تا کہ میں تمھیں اسکول چھوڑ دوں شاید تم امتحان میں شامل ہو سکو'' اسمتا ایک گھنٹہ دیر سے اسکول پہنچی پھر بھی مسٹر کیشون نے اس کی ٹیچر کو سمجھا کر اسے امتحان میں بٹھوا دیا مگر جب اسکول کا سالانہ نتیجہ آیا۔ اسے بہت مایوسی ہوئی کہ اس کی پوزیشن بجائے اوّل کے چوتھی آئی تھی۔

''اس دفعہ مجھے سبق مل گیا ہے'' اس نے خود ہی سوچ کر شکر کیا کہ بحفاظت خیریت سے اپنے گھر واپس آ گئی ہوں۔ اب اس نے خود سے پکا عہد کیا کہ'' آئندہ کبھی دیر نہیں کرے گی۔''

□□□

"اقلیتوں کی فلاح و بہبود اور تعلیم پر گفتگو" کے زیرِ عنوان منعقدہ کانفرنس میں پروفیسر مشیر الحسن (وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی) اور جناب منی جیکب
(جنرل سکریٹری آل انڈیا ایسوسی ایشن فار کرسچن ہائر ایجوکیشن) نے کلیدی خطبے پیش کیے۔ تصویر میں پروفیسر مشیر الحسن اور جناب منی جیکب کے علاوہ دیگر مندوبین کو بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

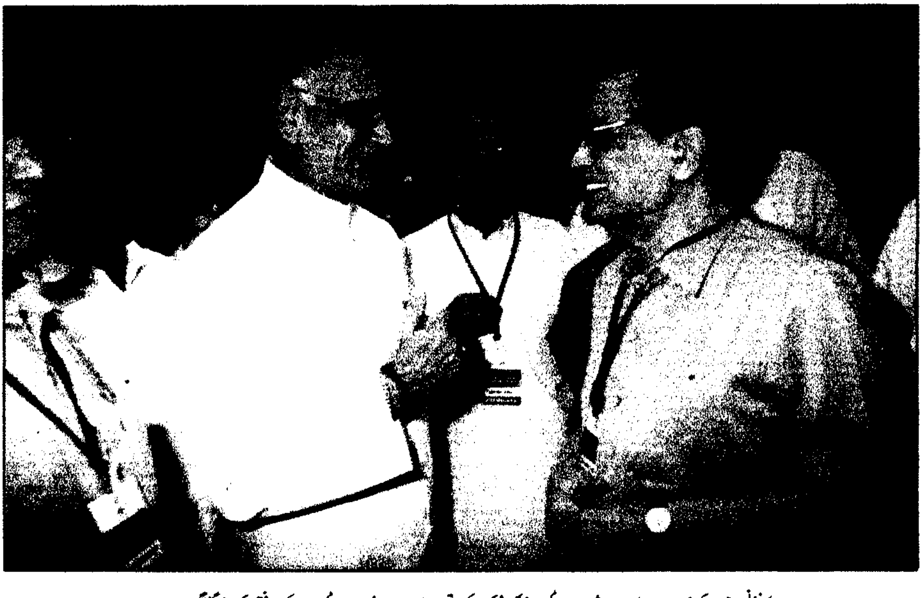

کانفرنس میں مرکزی وزیرِ داخلہ جناب شیوراج پاٹل نے بھی شرکت کی۔ تصویر میں جناب شیوراج پاٹل اور ڈاکٹر رفیق زکریا محوِ گفتگو ہیں۔

RNI No 70323/99 DL-15052 2003-5

**URDU DUNIYA** Monthly, August 2004, Vol. 6, Issue 8

*National Council for Promotion of Urdu Language*

Department of Secondary & Higher Education, Ministry of H.R.D., Government of India, New Delhi

گزشتہ 30 جون 2004 کو صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر اے۔ پی۔ جے۔ عبدالکلام نے ممتاز فلم ہدایت کار اور شاعر جناب گلزار کو پدم وبھوشن اور معروف اردو شخصیت پروفیسر گوپی چند نارنگ، صدر ساہتیہ اکادمی کو پدم بھوشن سے سرفراز کیا۔ قومی اردو کونسل انھیں مبارکباد پیش کرتی ہے۔

Printed and Published by Director, NCPUL on behalf of NCPUL, Printed at J.K. Offset Printers, Jama Masjid, Delhi-110006 and Published at NCPUL, West Block-I, Wing-6, R.K. Puram, New Delhi-110 066, Editor Dr. M. Hamidullah Bhat. Tel : 26103381, 26103938